FICTION HOUSE

مارکسی فلسفہ

سید سجاد ظہیر

مارکسی فلسفہ

مارکسی فلسفہ

سید سجاد ظہیر

فکشن ہاؤس

لاہور ○ کراچی ○ حیدرآباد

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

نام کتاب : مارکسی فلسفہ
مصنف : سید سجاد ظہیر
اہتمام : ظہور احمد خاں
پبلشرز : فکشن ہاؤس، لاہور
کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق : ریاض ظہور
اشاعت : 2017ء
قیمت : -/160 روپے

تقسیم کار:
فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 68-مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-36307550-1,37249218
فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 022-2780608
فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

فکشن ہاؤس
لاہور ○ کراچی ○ حیدر آباد
e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

کارل مارکس زندہ باد
سامراج مردہ باد

انتساب

کارل مارکس کے نام

فہرست

پیش لفظ

صنعتی انقلاب نے سرمایہ دارانہ نظام کو پیدا کیا جس کے نتیجے میں مزدوروں کے طبقے کی تشکیل ہوئی جنہوں نے محنت اور مشقت اور دن رات کی سختیاں جھیل کر سرمایہ دارانہ نظام کو پھیلایا۔ آرنلڈ ۔ٹوئن بی سینئر (Arnold Toynbee Senior) جس نے صنعتی انقلاب کی اصطلاح کو پہلی مرتبہ استعمال کیا۔ اُس نے معاشرے میں ہونے والی طبقاتی تقسیم کے بارے میں کہا کہ یہ دو قوموں میں بٹ گیا ہے یعنی سرمایہ دارا اور مزدور فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت زار پر فریڈرک اینگلز نے (Friedrich Engels) اپنی کتاب کنڈیشن آف ورکنگ کلاس اِن انگلینڈ (The Condition of the Working Class in England) میں تفصیل سے لکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مزدور طبقے نے سرمایہ دارانہ نظام کو مستحکم کرنے کی کتنی بھاری قیمت ادا کی۔

کارل مارکس نے اپنی پوری زندگی سرمایہ دارانہ نظام کو سمجھنے اور اس کے معاشرے پر ہونے والے اثرات پر صرف کردی وہ ایک عالم اور نظریات کے مطالعہ کے شائق تھا تاکہ علم کے ذریعے انسانیت کے لئے فلاح و بہبود کا راستہ دریافت کرے۔ جرمنی سے اُس نے فلسفہ اور تاریخ فرانس سے اُس نے سیاسیات اور انگلستان سے معیشت کے خیالات سیکھے اور اُن کی بنیاد پر مارکسی فلسفے کو تخلیق کیا۔ اُس

کے فلسفے نے سوچ کی نئی راہیں کھولیں اور اُس کی مدد سے معاشرے اُس کی ساخت، اُس روایات اور اُس کے عملی کردار کو سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اُس نے اُن انقلابی راہوں کی نشاندہی کی ہے کہ جو تبدیلی لے کر آتیں ہیں۔ یہ اس کے فلسفے کا نتیجہ ہے کہ روس، چین، کیوبا اور ویت نام میں انقلابات آئے اور آج بھی ایشیاء افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک اور اُن کے عوام اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کررہے ہیں۔ مارکسی فلسفے کا مطالعہ اس لئے ضروری ہے۔ کیونکہ یہ اس نئی سوچ دیتا ہے اور محروم طبقوں کے لئے تبدیلی کے ہتھیار فراہم کرتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

فروری 2017ء

تمہید

یہ چھوٹی سی کتاب اسٹالن کی شہرۂ آفاق تصنیف ''جدلی اور تاریخی مادیت'' سے ماخوذ ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں کارل مارکس کے انقلابی فلسفے کے بنیادی اصولوں کی تشریح کی گئی ہے۔ اس فلسفے کی مدد سے ہم قدرت میں، انسانی سماج میں اور انسان کے خیالات میں جو حرکت، تبدیلی اور ترقی ہوتی رہتی ہے اس کے قوانین کو سمجھ سکتے ہیں۔ ان قوانین کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ ان کو سمجھے بغیر ہم سرمایہ داری اور جاگیرداری کے فرسودہ نظام کو توڑ کر اس کی جگہ اشتراکی نظام نہیں قائم کر سکتے۔

مادہ قدیم ہے یا رُوح۔ ہمارے خیالات خارجی حقیقتوں کا عکس ہیں یا خارجی حقیقتیں ہمارے خیالات کا عکس ہیں۔ کیا خارجی حقیقتیں مثلاً چاند، تارے، دریا اور پہاڑ، کھیت اور کارخانے ہمارے ذہن کے باہر موجود ہیں یا یہ ساری کائنات صرف ہمارے خیالات اور تصورات کا کرشمہ ہے۔ مادہ متحرک ہے یا ساکت، یعنی کیا کائنات کی اور انسان کی کوئی تاریخ ہے یا وہ ہمیشہ سے یکساں طور پر قائم ہے۔ اجتماع ضدین و نقیضین محال ہے یا نہیں ہے۔ انسان آزاد ہے یا مجبور، یہ وہ مسائل ہیں جن پر زمانہ قدیم سے اب تک برابر بحث ہوتی چلی آئی ہے۔ اس کتابچے کو پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اس ساری بحث کا منشاء صرف تفریح یا وقت گزاری نہیں ہے بلکہ اس سے ہمارے سماج کے بہت

سے اہم مسائل کا حل وابستہ ہے۔

جب سے انسانی سماج میں حاکم اور محکوم طبقے پیدا ہوئے ہیں اور طبقاتی جنگ کا آغاز ہوا ہے ہمارا فلسفہ، زندگی اور ہمارے خیالات بھی دو طبقوں میں بٹ گئے ہیں۔ اس میں کسی ملک، قوم، مذہبی گروہ کی تخصیص نہیں ہے بلکہ ہر ملک، ہر قوم اور ہر مذہبی گروہ میں جہاں طبقات موجود ہیں۔ خیالات بھی دو طبقوں کے خیالات ہو گئے ہیں۔ اب تک ایک طرف حاکم طبقے کا فلسفہ رہا ہے جسے ہم خیال پرستی کے فلسفے سے تعبیر کرتے ہیں اور دوسری طرف محکوم طبقے کا فلسفہ جسے مادیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ افلاطون کے وقت سے آج تک خیال پرستوں نے ہر جگہ اپنے زمانے کے سماجی نظام کی حمایت کی ہے اور اس کو قائم رکھنے کے لئے فلسفے کے نئے نئے اصول بنائے ہیں۔ اس کے برعکس مادہ پرستوں نے ہر دور میں سماج کے اُبھرتے ہوئے طبقے، اُبھرتی ہوئی طاقتوں کا ساتھ دیا ہے اور سماجی نظام کو بدلنے میں ان کی حمایت کی ہے۔ طبقاتی جنگ نے فکری دنیا میں مادہ پرستی اور خیال پرستی کی جنگ کی شکل اختیار کی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ افلاطون کے وقت سے آج تک حکمران طبقے نے ہر ملک اور ہر دور میں مادہ پرستوں کے فلسفے کو بدنام کیا ہے اور خیال پرستی کو سراہا ہے۔ مادہ پرستی کو کبھی یہ کہہ کر مطعون کیا گیا کہ ان کا کوئی اعلیٰ نصب العین اور اصول زندگی نہیں ہوتا۔ کبھی ان پر یہ کہہ کر کیچڑ اُچھالی گئی کہ وہ اخلاق اور تہذیب سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ وہ تو نفس کے غلام اور روٹی کے بندے ہیں۔ وہ کھاؤ پیو اور مگن رہو کی تلقین کرتے ہیں۔ درآں حالیکہ انسان صرف روٹی کھا کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ انسان کا فرض ہے کہ مادی ضرورتوں کو پس پشت ڈال کر روحانیت کی اعلیٰ قدروں کی طرف متوجہ ہو اور اپنی خودی کو بڑھائے۔

ان دنوں ہمارے ملک میں بھی روحانی قدروں کو بڑھانے کا بڑا چرچا ہے۔ ہمارے مولویوں کا سارا کاروبار تو خیر سے اسی روحانیت کی تلقین کی بناء پر چلتا ہی تھا لیکن جوں جوں ملک میں سوشلزم کی مقبولیت بڑھ رہی ہے اور لوگوں میں سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام سے نفرت تیز ہو رہی ہے حکمران طبقہ اپنے تنخواہ یافتہ مولویوں، واعظوں اور ادیبوں کے ذریعے خیال پرستی کے رجعت پرست اور انقلاب دشمن فلسفے کو رواج دینے کی اور کوشش کر رہا ہے حتیٰ کہ ہمارے وزراء اور سرکاری افسران بھی اب اپنی تقریروں کے ذریعے ہم خاک نشینوں کو روحانی قدروں کے فلک ہفتم کی سیر کرانے لگے ہیں۔

پاکستان کے مسلم لیگی اور رجعت پرست اخبار اور رسالے بھی دن رات خیال پرستی کے تن بے جان میں زندگی کا خون دوڑانے کے لئے بہت بے چین ہیں اور سوشلزم اور کیمونزم کے انقلابی فلسفے کی مقبولیت کو کم کرنے کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی اور اپنے امریکی اور فرنگی آقاؤں کو یہ کہہ کر دھوکا دیتے ہیں کہ کیمونزم کا فتنہ پاکستان کی سرزمین پر سر نہیں اُٹھا سکتا۔ کیونکہ مسلمانوں میں عام طور سے اور پاکستان کے مسلمانوں میں خاص طور سے روحانیت بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ امریکی سرمایہ داروں کے ترجمان روزنامہ ''نیویارک ٹائمز'' نے حال ہی میں یہ کہہ کر اپنے ماہر اسلامیات ہونے کا ثبوت دیا ہے کہ کیمونزم کا زہریلا پودا پاکستان کی روحانی اور اسلامی فضا میں بار آور نہیں ہو سکتا۔

آج پاکستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کا فرسودہ اور رجعت پرست نظام اتنا بدنام ہو چکا ہے کہ لوگوں میں اس کی ساکھ اتنی گر چکی ہے کہ اب کسی گروہ یا جماعت میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ اس زوال پذیر نظام کی

حمایت علانیہ طور پر اور صاف لفظوں میں کر لے۔ خود وہ حضرات جن کا مفاد اسی نظام سے وابستہ ہے وہ بھی سرمایہ داری اور جاگیرداری کی سڑی گلی لاش کو ہاتھ لگاتے ڈرتے ہیں۔ وہ بھی اب اسلامی سوشلزم اور اسلامی نظام وغیرہ کی باتیں کرتے ہیں۔ پاکستان میں شرعی نظام کے قیام کا مژدہ سناتے ہیں۔

پاکستان میں ان دنوں مزدوروں کی انقلابی تحریک اور ان کے انقلابی فلسفے پر تین طرف سے حملہ کیا جا رہا ہے۔ مزدور تحریک کے سب سے بڑے دشمن تو سرمایہ دار، جاگیردار اور حکمران طبقے ہیں۔ اسی گروہ میں مسلم لیگ کا برسراقتدار[1] گروہ اور اس کے حاشیہ نشین بھی شامل ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے۔ پاکستان کی حکومت اسلامی حکومت ہے ہم کوشش کر رہے ہیں کہ یہاں جلد سے جلد اسلامی نظام رائج ہو جائے۔ ہم نے ملک کے دستور اساسی میں جو قرارداد مقاصد[2] رکھی ہے اس سے ہماری اصل غرض واضح ہو جاتی ہے جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کیسی اسلامی حکومت ہے اور یہ کیسا اسلامی نظام ہے جس میں نوے فیصد مسلمان ننگے، بھوکے، جاہل اور معاشی اعتبار سے پست ہیں۔ اور تمام سیاسی حقوق سے محروم۔ تو وہ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ابھی ہماری ریاست قائم ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ ملک میں اصلاح کی ضرورت ہے اور ہم آہستہ آہستہ اصلاح کر رہے ہیں۔ دشوری یہ آن پڑی ہے کہ لوگوں کے اخلاق خراب ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ قوم کے اخلاق کی اصلاح کی جائے۔ خدا سے ڈرایا جائے اور اسلام کے اصولوں پر چلایا جائے۔ خدا نے چاہا تو سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔

دوسرے گروہ میں زر پرست طبقوں کے وہ لوگ شامل ہیں جن کو سیاسی اقتدار

[1] یہ کتاب 1949ء میں تالیف ہوئی تھی لہٰذا برسر اقتدار گروہ سے مراد اس وقت کے مسلم لیگی حکمران تھا۔

[2] یہ قرارداد مقاصد پہلی آئین ساز اسمبلی میں خان لیاقت علی خاں نے پیش کی تھی۔

میں اب تک حصہ نہیں ملا ہے۔ وہ پاکستان میں خالص اسلامی اور شرعی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اگر یہاں شرعی حکومت قائم ہو جائے تو تمام مسلمانوں کی ساری دشواریاں دور ہو جائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان کی موجودہ حکومت غیر شرعی اور غیر اسلامی ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کے بارے میں بہت دنوں تک وہ گول مول باتیں کرتے رہے لیکن حالات نے انہیں ایک حد تک ایک ایسی پوزیشن واضح کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ مزدوروں اور کسانوں کی ہر طبقاتی عظیم اور طبقاتی جدوجہد کے سخت مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلامی حکومت میں مزدوروں اور کسانوں کو اتنی اجرت ملے گی کہ وہ اپنا پیٹ بھر سکیں اور آرام سے رہ سکیں مگر کارخانے اور کھیت ان کی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ معاشی مساوات کا نعرہ قوانین قدرت کے خلاف ہے۔ حکومت تو صرف اللہ کے برگزیدہ اور چنے ہوئے بندوں کی ہوگی نہ کہ عوام کی۔ یہ گروہ ایک طرف موجودہ حکومت اور حکمران طبقے پر اسلامی تاریخ، شریعت اور آیات قرآنی کے زور پر دباؤ ڈالتا ہے اور دوسری طرف دن رات اشتراکیت، مادیت اور مزدور تحریک کی سختی سے مخالفت کرتا رہتا ہے۔

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو صرف زبان سے سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کی مخالفت کرتے ہیں اور اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگاتے ہیں۔ ان کے خیال میں اسلام اور سوشلزم میں بہت تھوڑا سا فرق ہے۔ اس گروہ میں بھانت بھانت کا ابن الوقت شامل ہے۔ اس خیال کے اکثر لوگ مزدوروں کی یونینوں میں کام کرتے ہیں۔ مزدوروں کو بہکاتے ہیں۔ ان کی تنظیم میں پھوٹ ڈالتے ہیں۔ یہ لوگ سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہیں اور ان ہی کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ جب سے پاکستان بنا ہے انہوں نے اسلامی سوشلزم کی بات شروع کر دی ہے۔ ان کا مقصد مزدوروں کو انقلابی جدوجہد کی راہ سے ہٹا کر اصلاح پسندی یعنی سرمایہ داروں سے سمجھوتے کی

راہ پر لے جانا ہے۔

ایک چوتھا گروہ بھی ہے جو ایک ہی وقت میں ان تینوں گروہوں کا ساتھ دیتا ہے یہ گروہ پاکستان کے ابن الوقت اور رجعت پسند ادیبوں، مصنفوں اور اخبار نویسوں کا ہے۔ یہ لوگ ان دنوں ''اسلامی ادب، اسلامی آرٹ، پاکستانی ادب اور پاکستانی آرٹ'' کا پراپیگنڈا بڑے زور شور سے کر رہے ہیں اور کمیونزم کی مخالفت میں زہر اُگل رہے ہیں۔

اب اگر تینوں چاروں گروہوں کا جائزہ تاریخی مادیت کی روشنی میں لیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ ان کے فکر اور عمل میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ مثلاً

۱۔ ان میں سے ہر گروہ اسلامی نظام، اسلامی ریاست، اسلامی فلسفۂ حیات اور اسلامی قوانین کی تبلیغ کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسلام کے بارے میں ان کا تصور اور ان کی تعلیم ایک دوسرے سے تھوڑی مختلف ہے۔

۲۔ وہ پوری سوسائٹی کی ترقی اور بھلائی کی باتیں کرتے ہیں یعنی پاکستان کے سرمایہ دار بھی ترقی کریں اور مزدور بھی۔ جاگیردار بھی اور کاشت کار بھی، وہ طبقاتی تقسیم کی حقیقت سے انکار کرتے ہیں۔

۳۔ وہ قوم کی حالت چھوٹی موٹی اصلاح کر کے سدھارنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس کے لئے انقلاب کی ضرورت نہیں ہے۔ سماجی انقلاب سے تو ملک کو نقصان پہنچے گا۔

۴۔ وہ طبقاتی جدوجہد کے سخت دشمن ہیں۔ اس کے برعکس سرمایہ داروں اور مزدوروں اور جاگیرداروں اور کسانوں

میں سمجھوتہ، بھائی چارہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔

۵۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ پاکستان میں مزدوروں اور کسانوں کی جمہوری حکومت قائم ہو اور جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کی جگہ اشتراکی نظام رائج ہو۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ طبقاتی مفاد کی یگانگت اور مزدوروں اور کسانوں کی انقلابی تحریک سے نفرت کے علاوہ ان لوگوں کی فکری اساس بھی ہم سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ یہ لوگ خیال پرست ہیں۔ یہ لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں کہ کائنات کی اور انسانی سوسائٹی کی ایک ارتقائی تاریخ ہے۔ کائنات کی ہر چیز حرکت کرتی، بدلتی رہتی ہے۔ وجود میں آتی اور فنا ہوتی رہتی ہے وہ زندگی اور اس کے تغیرات کو ان کے تاریخی پس منظر میں نہیں دیکھتے بلکہ انہیں اس پس منظر سے الگ کر کے دیکھتے ہیں۔ وہ ان تعلقات کو، ان رشتوں کو بھی نہیں دیکھتے جو چیزوں میں قائم ہیں۔ وہ کائنات کو اس کی ''زندگی'' میں نہیں بلکہ اس کی ''موت کی حالت'' میں دیکھتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بھی انکار کرتے ہیں کہ کائنات میں اور انسانی سماج میں تبدیلی اور ترقی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ہر شے کے اندر دو متضاد قوتیں اپنا کام کرتی رہتی ہیں ان میں آپس میں ٹکر ہوتی رہتی ہے۔ اس تبدیلی اور حرکت کا کوئی ایک دائرہ نہیں ہے جس میں وہ چکر کاٹتی رہتی ہو بلکہ وہ انقلابی جست کر کے نت نئی شکلیں اختیار کرتی ہے۔

یہ لوگ اپنے عمل سے اس تاریخی حقیقت کو بھی جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسانی سوسائٹی ہزاروں سال سے ارتقائی مدارج طے کرتی چلی آرہی ہے۔ ابتداء میں قدیم اشتراکی نظام تھا۔ اس کے بعد سرمایہ داری نظام اور اب دنیا کے ایک بڑے حصے میں اشتراکی نظام قائم ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ پاکستان کا سرمایہ داری

اور جاگیرداری نظام کوئی ایسی چیز نہیں جسے بدلا نہ جا سکتا ہو یا جس کا بدلنا قانونِ قدرت کے خلاف ہو۔ اس کتابچے کو پڑھنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ سوسائٹی کیوں ارتقائی مدارج طے کرتی ہے اور کیوں پیداوار کے طریقے یعنی آلات اور اوزار کے بدل جانے سے سماج کا پورا معاشی، سیاسی اور ذہنی ڈھانچہ بدل جاتا ہے۔ خیالات ہمارے معاشی اور سماجی ڈھانچے کو نہیں بدلتے بلکہ معاشی ڈھانچے کے بدلنے سے ہمارے خیالات بھی بدل جاتے ہیں۔

اس لئے جب خیال پرست کہتے ہیں کہ ہم زندگی کے ان قوانین کو جو آج سے ہزار دو ہزار برس پہلے قبیلہ داری سماج میں یا ریاست کی ضرورت کے تحت بنے تھے دوبارہ رائج کریں گے تو ہم ان سے کہتے ہیں کہ تمہارا یہ تصور غیر تاریخی ہے۔ تم تاریخ کے پہیے کو پیچھے کی طرف نہیں لے جا سکتے۔ اس کی کوشش کرنا دراصل قوم اور ملک کے مفاد کو نقصان پہنچانا ہے۔ اس سے غداری کرنا ہے۔

یورپ اور ہندوستان میں بھی اس خیال کے لوگوں کی کمی نہیں ہے یورپ کے خیال پرست توریت اور انجیل سے اپنے موجودہ مسائل کا حل ڈھونڈتے ہیں اور ہندوستان کے خیال پرست ویدوں سے۔ وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ زندگی کے یہ اصول اور قوانین کب اور کن حالات میں مرتب کئے گئے تھے۔ ہمیں تو بس یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ اصول اچھے ہیں یا نہیں۔ اگر اچھے ہیں تو ہمیں ان اصولوں پر عمل کرنا چاہئے۔ لیکن ان زریں اصولوں پر اب تک عمل کیوں نہیں ہوا۔ اور آج بھی لوگ ان پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ اس سوال کے جواب میں خیال پرست کہتے ہیں کہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ لوگوں نے ان اصولوں کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا۔ اب لوگوں کو صحیح مفہوم سمجھانے کا بیڑا یہ حضرت اُٹھا رہے ہیں۔ لیکن سماج اور سماجی زندگی کے ارتقاء کی بنیاد ہماری خواہشیں نہیں بلکہ مادی حالات

ہیں۔ ان حالات کا تعلق اس سے ہے کہ ہم دولت کس طرح پیدا کرتے ہیں۔ کون سے اوزار اور آلات استعمال کرتے ہیں۔ پیداوار کے سلسلے میں انسانوں میں کیا رشتے قائم ہوتے ہیں۔ کون نہیں چاہتا کہ پنجاب اور سندھ کے ریگستانوں میں شفاف پانی کی نہریں بہنے لگیں اور کھیتیاں لہلہائیں لیکن اس خواہش کی تکمیل صرف خواہش کرنے سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے ہمیں ایسے حالات پیدا کرنے ہوں گے جن کے بغیر ریگستانوں کو مرغزار نہیں بنایا جا سکتا اور پھر یہ سوچنا ہو گا کہ آیا ہمارے پاس اس کے ذرائع موجود ہیں یا نہیں۔ ورنہ ہماری خواہش اور شیخ چلی کے منصوبوں میں کوئی فرق نہیں ہو گا۔

خیال پرستوں کی بنیادی خرابی یہی ہے کہ وہ خیال کو مادے سے مقدم اور مادی حرکت کے قوانین سے بے نیاز سمجھتے ہیں۔ وہ چیزوں کو ان کے تاریخی پس منظر سے الگ کر کے زمان اور مکان کی قید سے آزاد کر کے دیکھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں مانتے کہ خیالات بھی مادی چیزوں کی طرح ایک خاص وقت میں ایک خاص عہد میں اور خاص حالات کے تحت پیدا ہوتے ہیں اور پھر فنا ہو جاتے ہیں۔ بدلے ہوئے حالات اور بدلے ہوئے زمانے میں ان کو زندہ کرنا، انہیں رواج دینا ممکن نہیں بلکہ محال ہے۔ وقت اور تاریخ کی رفتار کو نہ روکا جا سکتا ہے اور نہ ان کا رُخ پیچھے کی طرف کیا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے والے دراصل لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ ان کی انقلابی تحریک کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ انہیں اوہام پرستی میں اُلجھاتے ہیں۔ انہیں آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔

آج دنیا دو کیمپوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک طرف ساری دنیا کے کروڑوں مزدور اور کسان اور دانشور اور مظلوم متوسط طبقے کے لوگ ہیں جن کی بہت بڑی اکثریت تاریخی مادیت کے انقلابی فلسفۂ زندگی کو مان کر اس پر عمل کر رہی ہے اور اسی

کے باعث ترقی کر رہی ہے۔ دوسری طرف سامراجیوں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور ان کے مٹھی بھر حوالیوں اور موالیوں کا گروہ ہے جو بہت کمزور ہو چکا ہے۔ جس کی طاقت ترقی پسندوں کے مقابلے میں بہت کم ہے اور برابر گھٹتی جا رہی ہے اسی وجہ سے یہ زوال پذیر گروہ گھبرا گھبرا کر خیال پرستی اور اوہام پرستی کا زنگ آلود ہتھیار استعمال کر رہا ہے۔ لیکن سرمایہ داری کی ڈوبتی ہوئی ناؤ اس تنکے کے سہارے اب بہت دن نہیں چل سکتی۔ ضرورت ہے کہ پاکستان کے جمہوری اور انقلابی عناصر مزدور، کسان، ترقی پسند ادیب اور دانشور اور مظلوم متوسط طبقہ، تاریخی مادیت کے انقلابی اسلحوں سے مسلح ہوں اور اپنے دشمنوں کو ہمیشہ کے لئے قعر گمنامی میں پھینک دیں۔

......☆☆☆......

۲

خیال پرستی

اور

جدلی مادیت

ہمارے موجودہ سماج میں حکمران طبقہ نے ذرائع پیداوار (کارخانوں، مشینوں، ذرائع آمدورفت ورسل ورسائل، زمین، نہروں، دریاؤں، پیداوار وغیرہ) پر قابض ہونے کی وجہ سے محنت کش مزدوروں، کسانوں، دیہاتی مزدوروں اور درمیانی طبقے کو اپنا معاشی دست نگر بنا لیا ہے۔ حکمران سرمایہ دار اور جاگیردار ریاست وحکومت کو محنت کشوں کے دبانے اور کچلنے کے لئے وضع کرتے ہیں۔ سرمایہ داروں کی ریاست کے مختلف اراکین یعنی فوج، پولیس، عدالتیں، جیل خانے اور تمام دوسرے سرکاری عملے ان کے اقتدار کو بزور قائم رکھنے کے لئے قائم اور استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن سرمایہ دار اور جاگیردار حکمران طبقے اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے ظلم وجور واستحصال کو چھپانے کے لئے وہ ایسے نظریوں، ایسے خیالات، ایسے عقائد، ایسے توہمات، ایسے آرٹ، ایسی تعلیم اور ایسی خبروں کی ترویج کرتے ہیں جو عام لوگوں کے دل ودماغ کو گمراہ، معطل یا

ماؤف کر دے، جو انہیں موجودہ ظالمانہ، سیاسی اور معاشی سماجی نظام کی جانب سے مطمئن کر دے۔ یا اس کا طرف دار بنا دے۔ یا جو انہیں پست ہمت، مایوس اور بے عمل کر دے یا ان میں انتشار و تفریق پیدا کر دے یا بے کار اور فضول باتوں میں اُلجھا کر زندگی کی حقیقتوں سے دُور کر دے۔ الغرض ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح مظلوم عوام کی اکثریت کو عوامی، جمہوری، پرولتاری (مزدور) انقلاب اور اس کی جدوجہد سے یعنی اس جدوجہد سے جو موجودہ نظام کو ختم کرنے کے لئے جاری ہے الگ اور بے تعلق کر دیا جائے۔

لیکن یہ سرمایہ دارانہ نظام، اس کی معیشت، اس کی حکومت اور اس کی ریاست کی دست درازیوں کے خلاف سب سے پہلے اور سب سے آگے بڑھ کر صنعتی مزدور جدوجہد کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ سماج کے دوسرے مظلوم طبقے، کسان، دیہاتی مزدور، درمیانی طبقے کے غریب لوگ بھی منظم ہو کر جدوجہد کرنا سیکھتے ہیں۔ ٹریڈ یونین، کسان سبھا، مزدوروں کی سیاسی پارٹی وجود میں آتی ہے۔ طبقاتی جنگ جو سماج میں ظالم اور مظلوم، امیر اور غریب، محنت کرنے والوں اور دوسروں کی محنت سے ناجائز طور پر مستفید ہونے والوں کے مابین ہمیشہ سے جاری ہے اب ایک باقاعدہ شکل اختیار کرنے لگتی ہے۔ ایک ایسی شکل جس میں اس کا امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ سرمایہ دار اور جاگیر دار نظام کا تختہ اُلٹ کر سیاسی اور معاشی اقتدار اور مزدور طبقے اور اس کا ساتھ دینے والے کسان اور درمیانی طبقے کے ہاتھ میں آئے۔ سرمایہ داروں کی آمریت کی جگہ مزدور طبقے کا راج قائم ہو۔ مٹھی بھر امیروں کی حکومت کی جگہ عوام کی حکومت یعنی سچی جمہوریت قائم ہو۔ اس جدوجہد کے دوران میں خیال و فکر کی دنیا میں بھی دو محاذ قائم ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام کی تخیل، دوسری طرف اس کی مخالف، اس کو رد کرنے والی مزدور طبقے کی انقلابی تخیل۔ ایک طرف وہ روحانی

افیون جس کا کام ذہن اور فکر کو زوال پذیر اور مرگ آفریں سرمایہ دار سماج کا حامی اور طرفدار بنانا ہے۔ دوسری طرف شعور و بصیرت بڑھانے والی تخیل جس کا کام سماجی حقیقت کو سمجھنا اور اس کے ساتھ ساتھ حرکت و عمل کا جذبہ پیدا کر کے لوگوں کو پرانے نظام کو نیست و نابود کرنے اور نئے نظام حیات کی تعمیر کے لئے آمادہ کرنا ہے۔

پہلی یعنی سرمایہ دارانہ (بورژوا) تخیل کی فلسفیانہ بنیاد خیال پرستی (آئیڈیالزم) پر قائم ہے۔ دوسری یعنی مزدور (پرولتاری) تخیل کی بنیاد جدلی مادیت (ڈائی لک ٹیکل لے ٹی ریالزم) پر قائم ہے۔ پہلی تخیل رجعت پسند ہے۔ دوسری ترقی پسند ہے۔ انقلابی ہے۔ اس تخیل کو کارل مارکس نے باقاعدہ نظریہ کی شکل دی ہے۔

خیال پرستی کیا ہے؟ خیال پرستی اس فلسفہ کو کہیں گے جس کی رُو سے کائنات، فطرت، مادی دنیا میں ہونے والے حادثات اور واقعات سماج کی مادی زندگی بنیادی طور پر کسی مافوق الادراک طاقت، فطری دنیا اور فطری حادثات سے پرے۔ کسی اَن دیکھی، کسی سمجھ میں نہ آنے والی نامعلوم مادی دنیا سے غیر متعلق، مادی کائنات، مادی دنیا اور مادی سماج سے باہر و برتر ہمیشہ سے موجود اور ہمیشہ رہنے والی طاقت، ذہن یا عقلِ کُل، یا الوہیت کا نتیجہ ہیں یا اس سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں یا اس کا اظہار ہیں یا اس سے نکلے ہیں۔

خیال پرستوں کے نزدیک تصور خیال، اولین اور مادی زندگی، مادی ماحول ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تاریخ اتفاقات و ناگہانی واقعات کا مجموعہ ہے۔ ان کے نزدیک کوئی بڑا آدمی، کوئی برگزیدہ ہستی[1] ایک خاص وقت میں پیدا ہو کر انسانی سماج کی کایا پلٹ دیتی ہے۔ وہ تاریخی اور سماجی تبدیلیوں میں مادی ماحول، مادی زندگی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ اگر کسی زمانے میں سماج میں غلام اور آقا

[1] جو انسانی سمجھ سے باہر ہو۔

میں کوئی تفریق تھی تو وہ بھی کسی نامعلوم مشیت کے سبب تھی۔ اگر جاگیردار اور زرعی غلام کی تفریق تھی یا اب اگر سرمایہ دار اور مزدور کی تصدیق ہے تو اس کا کوئی مادی سبب نہیں۔ ان کے نزدیک کچھ انسان فطرتاً اچھے ہوتے ہیں کچھ برے ہیں، کچھ خوش قسمت ہوتے ہیں، کچھ بدنصیب۔ ذاتی ملکیت، امیری غریبی، عزت اور ذلت اتفاقیہ ہیں۔ اچھائی اور برائی کے معیار اخلاق کے اصول، مختلف ملکوں اور مختلف اقوام میں کسی بڑی روحانی تحریک کسی مذہب یا کسی پیشوا نے ہمیشہ کے لئے متعین کر دیئے ہیں۔ اگر ان لوگوں سے دریافت کیا جائے کہ ان عقائد اور ان اصولوں میں تبدیلی کیوں ہوتی ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ یہ کسی مافوق الادراک طاقت کا کام ہے۔ اس کی مصلحت کا نتیجہ ہے۔ انسانوں کی اپنی زندگی سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔

جدلیاتی مادیت، فطرت اور سماج کو بالکل دوسری طرح سے سمجھنے کا طریقہ ہے۔ جدلیت سے مراد یہ ہے کہ فطرت کے حوادثات پر متحرک ہوتے ہیں۔ وہ برابر بدلتے رہتے ہیں اور فطرت کی متضاد طاقتوں کے باہمی جدل سے فطرت کا ارتقاء ہوتا ہے۔

خیال پرستوں کے نزدیک فطرت اشیاء اور حوادث کا ایک اتفاقی مجموعہ ہے۔ وہ حوادثات اور اشیاء کو ایک دوسرے پر نظر انداز ہوتے ہوئے، ایک دوسرے کو بدلتے ہوئے، ایک دوسرے سے بندھوا نہیں سکتے۔ اس کے برخلاف جدلیت فطری واقعات اور حادثات کو ایک دوسرے سے متعلق ہر فطری حادثہ کو اس کے ماحول اور دوسرے حوادث کو ایک دوسرے سے متعلق ہر فطری حادثہ کو اس کے ماحول اور دوسرے حوادث سے اثر پذیر سمجھتی ہے۔ اس کے نزدیک کوئی ایک فطری حادثہ اس وقت تک سمجھا نہیں جاسکتا جب تک اس کے اردگرد کے حوادث سے ان کے تعلق کو نہ سمجھا جائے۔

جدلیت کا یہ قانون محض فطری حادثات کے ارتقاء میں کارفرما نہیں بلکہ انسانی

معیشت اور انسانی تاریخ کے ارتقاء میں بھی موجود ہے۔ اس کی رو سے سماجی نظام کا ارتقاء یا تاریخ میں سماجی تبدیلی کسی اٹل یا ابدی تصور یا کسی بیرونی آفاقی تصور کے ماتحت نہیں ہوتی۔ ہر سماجی تبدیلی کے اسباب اس کے گردوپیش کے حالات میں پنہاں ہوتے ہیں۔ ہر سماجی تبدیلی کو سمجھنے کے لئے ان تمام دوسرے حالات کو سمجھنا ضروری ہے جن سے اس کی تبدیلی کا تعلق ہے۔

مثلاً ہم جانتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب کہ دنیا میں غلامی کا رواج تھا۔ حکمران طبقہ انسانوں کے ایک گروہ پر حکومت کا حق رکھتا تھا اور غلام سماج میں دستکاری، زراعت اور دوسرے کام کر کے سماج کی معاشی دولت پیدا کرتے تھے۔ موجودہ عہد میں غلام جرم ہے۔ مہذب انسان غلامی کو عہدِ دحشت اور بربریت کی یادگار سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ عہد غلامی سے پہلے سماج کی تنظیم ابتدائی اشتراکیت کی بنیاد پر تھی۔ غلامی کا دور اس ابتدائی اشتراکی دَور کے بعد قائم ہوا۔ ایسا کیوں ہوا؟

ابتدائی اشتراکیت کے دَور میں انسانوں کے پاس صرف پتھر کے اوزار تھے۔ اس کے بعد انہوں نے تیر کمان کی ایجاد کی۔ اس زمانے میں ہتھیار کے نہایت کمزور قسم کے ہونے کی وجہ سے انسانوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ مل جل کر قدرت کی طاقتوں اور جنگلی جانوروں کا مقابلہ کریں۔ شکار کھیلنے، مچھلی پکڑنے، پھل جمع کرنے اور آب و ہوا کی شدت سے اپنے کو بچانے کے لئے انسانوں کا ساتھ مل کر کام کرنا ضروری تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو جنگلی جانوروں یا ہمسایہ دشمن قبیلوں کے ہاتھوں ہلاک ہو جاتے۔ ایک ساتھ کام کرنے کی ضرورت کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنے آلاتِ پیداوار (ہتھیار وغیرہ) اور ان آلات سے حاصل کی ہوئی چیزوں پر مشترک ملکیت قائم کریں۔ اس زمانے میں سوائے چند چیزوں کے زیادہ تر چیزیں مشترک ملکیت تھیں۔ اس سماج میں طبقہ داری کی تفریق نہیں تھی۔ اس زمانے میں انسانوں کا ایک

گروہ دوسرے انسانوں کی دست برد نہیں کرتا تھا۔

رفتہ رفتہ انسانوں نے دوسری دھاتوں کے اوزار اور بہتر ہتھیاروں کی ایجاد کی۔ انہوں نے دست کاری کے ذریعے مختلف قسم کی چیزیں سانا شروع کیں۔ وہ مویشی پالنے لگے۔ انہوں نے زمین کی کاشت کرنے کا طریقہ دریافت کیا۔ ان ایجادوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف لوگ مختلف کام کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اب زیادہ چیزیں بننے اور پیدا ہونے لگیں۔ اس کا امکان ہوا کہ چیزوں کا ایک دوسرے سے تبادلہ کیا جائے۔ ایک قبیلے والے دوسرے قبیلے والوں سے اپنی زائد پیداوار کا تبادلہ کریں۔ اس کا امکان ہوا کہ بعض افراد کے ہاتھ میں دولت کا ذخیرہ جمع ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا بھی امکان پیدا ہوا کہ دولت کا ذخیرہ رکھنے والے بعض افراد دوسرے افراد کو (جن کے پاس دولت نہ تھی) اپنا غلام بنائیں اور بے جان چیز کی طرح خرید سکیں، بیچ سکیں، اس سے کام لے سکیں۔ اب پہلی سی مشترک ملکیت، برابری قائم نہ رہ سکی۔ پرانے سماج کا نظام ٹوٹ گیا۔ ذاتی ملکیت، طبقہ داری تقسیم (غلام اور آقا) وجود میں آئی۔ وسائل پیداوار پہلے کی طرح مشترک ملکیت نہ رہے۔ محنت نہ کرنے والا آقا محنت کرنے والے غلام سے کام لینے لگا۔ غلام اس کی ملکیت ہو گیا۔

سماج میں اس بنیادی تبدیلی کا سبب آلات و ذرائع پیداوار میں تبدیلی کا ہو جانا ہے۔ ابتدائی عہدِ اشتراکیت کے وسائل پیداوار، اس زمانے کی سماجی تنظیم اور معاشرے کے رشتوں میں بھی تبدیلی ہوئی۔ آقا اور غلام کی بنیاد پر سماج کی تنظیم اس دوسرے عہد کے وسائل پیداوار کے مطابق تھی۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانے کی اشتراکیت کا نظام یا اس کے بعد کا غلامی کا نظام کسی ابدی تصور یا کسی تاریخی سانحہ کا نتیجہ نہ تھے بلکہ ان کی ٹھوس معاشی بنیادیں تھیں۔ ان معاشی بنیادوں میں تبدیلی کے سبب سے سماج کا نظام، سماج میں

انسانوں کے باہمی تعلقات اور سیاسی نظام میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس لئے جدلیت کے اصول کے مطابق سماجی تبدیلیوں کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس تبدیلی کے گرد و پیش کے حالات، موقع محل اور وقت کو سمجھنا ضروری ہے۔

جدلیت کے نزدیک فطرت ساکن، غیر متحرک جامد نہیں ہے بلکہ اس میں برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ وہ مستقل ارتقاء کی حالت میں ہے۔ اس میں بعض چیزیں بڑھتی اور ترقی کرتی رہتی ہیں۔ بعض چیزیں منتشر اور برباد ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے حادثات و واقعات کو سمجھنے کے لئے نہ صرف ان کے باہمی رشتوں اور باہمی تعلقات کا معلوم کرنا ضروری ہے بلکہ ان کی حرکت، ان کی تبدیلی، ان کے وجود میں آنے اور مٹ جانے کے عمل کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی چیز ایک خاص وقت میں بہت مستحکم معلوم ہوتی ہو۔ لیکن فی الواقع اس کا زوال شروع ہو چکا ہو اور کوئی دوسری چیز ایک خاص وقت میں کمزور اور زوال پذیر اور غیر مستحکم معلوم ہوتی ہو لیکن درحقیقت وہ بڑھ رہی ہو اور ترقی کر رہی ہو۔ جدلیت اسی چیز کو مضبوط سمجھتی ہے جو بڑھ رہی ہو۔ جس میں نمو ہو۔ جس کی طاقت میں اضافہ ہو رہا ہو۔

جدلیت کے اس اصول کی رو سے اگر ہم سماج کو دیکھیں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ کوئی سماجی نظام اَن مٹ اور اٹل نہیں ہے۔ ذاتی ملکیت کا ''حق'' کوئی ابدی یا آفاقی کلیہ نہیں ہے۔ جاگیردار اور کسان کا رشتہ کسی ''ابدی انصاف'' کے اصول پر مبنی نہیں ہے۔ سرمایہ داری کا نظام، سرمایہ دار اور مزدور کا موجودہ رشتہ، عدل کے کسی لافانی تصور کی پیداوار نہیں ہے۔ جس طرح غلامی کا نظام ختم ہو کر جاگیرداری کا نظام قائم ہوا، جس طرح جاگیرداری نظام پر سرمایہ داری حاوی ہو گئی، اسی طرح حالات کے تقاضے کے مطابق سرمایہ داری نظام کو مٹا کر سوشلزم یا اشتراکیت کا نظام قائم ہو گا۔

اس لئے ہمیں چاہئے کہ زوال پذیر اداروں اور نظاموں اور طبقوں کی طرف

رُخ کر کے ان سے اُمیدیں نہ لگائیں۔ خواہ وہ بڑے طاقتور اور مضبوط ہی کیوں نہ ہوں۔ اس لئے کہ ان کی طاقت مٹ جانے والی ہے۔ ہم کو ان طاقتوں، ان اُبھرتی ہوئی تحریکوں کا ساتھ دینا چاہئے جو کمزور ہوتے ہوئے بھی بڑھنے والی، ترقی پسند تحریکیں اور طاقتیں ہیں۔

پاکستان اور ہندوستان کے مارکسی (کمیونسٹ) صنعتی مزدور طبقے کی رہنمائی پر کیوں زور دیتے ہیں؟ سوشلسٹ پارٹی والے اور بعض دوسرے لوگ مارکسیوں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ پاکستان اور ہندوستان میں صنعتی مزدور (پرولتاریت) کی تعداد کسانوں کے مقابلے میں بہت تھوڑی ہے۔ اس لئے یہاں کے انقلابیوں کو اپنی سیاست کی بنیاد کسانوں پر رکھنی چاہئے۔ لیکن مارکسی جانتے ہیں کہ موجودہ سماج میں پرولتاریت ایک بڑھنے والا اور زیادہ ترقی کرنے والا طبقہ ہے۔ حالانکہ اس کی تعداد کم ہے۔ کسان تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود ایک طبقہ کی حیثیت سے انتشار پذیر ہیں۔ یعنی پرانے جاگیرداری نظام پر سرمایہ داری کے حاوی ہو جانے کی وجہ سے وہ بحیثیت ایک طبقے کے گرتے اور ٹوٹتے جارہے ہیں۔ اس لئے کسان طبقہ بغیر مزدور طبقے سے اتحاد قائم کئے بغیر مزدور طبقے کی رہنمائی کے نہ اپنی تنظیم کرسکتا ہے اور نہ جمہوری انقلاب کو کامیاب کرسکتا ہے۔ اسی لئے مارکسیوں کی سیاست مزدور طبقے کی سیاست ہے۔

جدلی عمل

ارتقائی عمل کا بھی ایک مخصوص جدلی طریقہ ہے۔ تبدیلیاں ایک خاص طریقے سے ہوتی ہیں۔ ارتقاء میں یہ نہیں ہوتا کہ ایک چیز محض مقداری حیثیت سے رفتہ رفتہ بدلتی چلی جائے اور اس کی ماہیت نہ بدلے۔ وہ صفاتی حیثیت سے نہ بدلے۔ ہوتا یہ

ہے کہ مقداری حیثیت میں رفتہ رفتہ تقریباً نامعلوم طور پر بدلتے بدلتے ایک ایسا مقام آتا ہے جب کہ یک بیک جیسے ایک جست لگا کر مقداری حیثیت، صفاتی حیثیت سے بدل جاتی ہے۔ ایک حالت سے بالکل دوسری حالت جو کہ اپنے مافیہ کے لحاظ سے اپنی صفت اور ماہیت کے لحاظ سے بالکل مختلف ہوتی ہے پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ صفاتی یا ماہیتی تبدیلی اتفاقیہ نہیں ہوتی بلکہ صفاتی تبدیلی کے رفتہ رفتہ نامعلوم طور پر بڑھ جانے سے پیدا ہوتی ہے۔

اس لئے جدلیت کی رو سے ارتقائی عمل ایک دائرے کے اندر ہونے والا عمل نہیں ہے، یعنی یہ نہیں ہوتا کہ ایک ہی قسم کی مقداری تبدیلی مسلسل ہوتی رہے بلکہ وہ ایک آگے بڑھتا ہوا عمل، سادگی سے پیچیدگی کی طرف بڑھتا ہوا عمل، پرانی صفت سے نئی صفت یا نئی ماہیت کی طرف بڑھتا ہوا عمل ہوتا ہے۔

فطرت میں جدلیت کے اس اصول کا ثبوت ڈارون کی تحقیق سے ملتا ہے۔ جس نے ثابت کر دیا ہے کہ نباتات اور حیوانات، درخت اور پودے اور انسان لاکھوں سال کے ارتقاء کا نتیجہ ہیں۔ اسی طرح سے یہ مابعدالطبیعاتی تصور کہ دنیا اور تمام حیوانات اور نباتات وغیرہ ایک ابدی سانچے میں ڈھلے ہیں سراسر غلط ثابت ہو گیا۔ یہ ثابت ہو گیا کہ ہر چیز کی تاریخ ہے۔ ہر چیز کا ارتقاء ہوا ہے اور کسی ابدی چکر کا تصور بے بنیاد ہے۔

طبیعات سے بھی ارتقاء کے اس طریقہ کا کہ مقداری تبدیلی ایک مقام پر پہنچ کر یکا یک صفاتی یا ماہیتی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ ثبوت ملتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم پانی کو لیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ ایک حد تک حرارت کا اس کی رقیق ماہیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اگر پانی کی حرارت کو برابر بڑھ لے جائیں تو ایک خاص نقطۂ حرارت پر پہنچ کر پانی، پانی نہیں رہتا۔ اس میں صفاتی یا ماہیتی تبدیلی ہو جاتی ہے اور وہ بھاپ بن جاتا

ہے۔ اسی طرح اگر ہم پانی کی حرارت کو کم کرتے جائیں تو ایک مقام پر پہنچ کر وہ یکایک جم جاتا ہے۔ وہ پانی نہیں رہتا، برف بن جاتی ہے۔

بے جان مادے میں جان بھی اسی جدلی طور سے پیدا ہوتی ہے۔ بعض بے جان اشیاء اسی ارتقائی اصول کے مطابق بدلتی رہتی ہیں۔ پہلے ان میں کوئی ماہیتی تبدیلی نہیں ہوتی۔ وہ صرف مقداری اعتبار سے بدلتی ہیں۔ آخر کو ایک انتہا پر پہنچ کر بے جان شے کی ماہیت بدل جاتی ہے۔ بیک جست وہ دوسری چیز بن جاتی ہے۔ بے جان شے کی جگہ جاندار شے وجود میں آ جاتی ہے۔ اسی طرح کے بدلنے کو جدلیت میں ''صفاتی یا ماہیتی جست'' کہتے ہیں۔

سیاسی اور معاشرتی انقلاب (یعنی جب زوال پذیر حکمران طبقے کے اقتدار کا طاقت کے ذریعے سے یکایک تختہ اُلٹ دیا جاتا ہے اور اقتدار اس طبقہ کے ہاتھوں میں آ جاتا ہے جو سماج کو ترقی کی طرف لے جانے کا اہل ہے۔ لیکن جس کو بزور سیاسی اقتدار سے محروم رکھا گیا تھا) اسی قسم کی ایک ماہیتی جست ہے جس کے ذریعے سے پرانی معاشرت یا سماج کی پرانی تنظیم یکسر بدل جاتی ہے۔ اس طرح کی بنیادی تبدیلی کا سماج میں انقلاب کے ذریعے سے ہی وجود میں آنا ممکن ہے۔ اس لئے وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کو رفتہ رفتہ اصلاحوں کے ذریعے سے بدل کر سوشلسٹ یا اشتراکی نظام میں بدلا جا سکتا ہے، غلطی کرتے ہیں۔ بنیادی یا ماہیتی، معاشرتی اور سیاسی تبدیلی صرف انقلاب کے ذریعے سے ہی ممکن ہے۔ اس لئے سچی ترقی پسند سیاست کو انقلابی سیاست ہونا چاہئے نہ کہ اصلاح پسند۔ اس لئے ہمارے ملک میں وہ سیاسی جماعتیں جیسے ہندوستان میں سوشلسٹ پارٹی اور پاکستان کے زیادہ تر ''ترقی پسند'' (مسلم لیگی گروہ) جو یہ کہتے ہیں کہ موجودہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کو وہ [illegible] اصلاحات کے ذریعے سے بدل دیں گے۔ فی الحقیقت عوام کو اصلاح پسندی

کے دھوکے میں ڈال کر موجودہ ظالمانہ نظام کے قیام میں مدد دیتے ہیں۔ برسر اقتدار جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے اقتدار کو ختم کر کے مزدور کسان راج قائم کرنا محض انقلاب کے ذریعے سے ہی ممکن ہے۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم ایسی سیاست اختیار کریں جو ہمیں اس انقلاب کی طرف لے جائے نہ کہ ایسی سیاست جو ہمیں اصلاح پسندی کی دلدل میں پھنسا کر اپنے اصلی مقصد سے دور کر دے۔

معاشرتی اور سیاسی انقلاب ارتقاء کے اس جدلی اصول کے بالکل مطابق ہے جس کی رُو سے رفتہ رفتہ ہونے والی مقداری تبدیلی ایک مقام پر پہنچ کر دفعتہ ماہیتی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ مظلوم طبقوں کا انقلابی عمل ایک فطری اور لازمی چیز ہے۔

جدلیت کے نزدیک فطرت کے تمام مظاہر اور حوادث میں اندرونی تضاد ہوتا ہے۔ ہر چیز کا ایک مثبت اور ایک منفی پہلو ہوتا ہے۔ ہر چیز کا ایک ماضی اور ایک مستقبل ہوتا ہے۔ ہر چیز وجود میں آتی رہتی ہے اور فنا ہوتی رہتی ہے۔ ارتقائی عمل یا چیزوں کی نمو اور ترقی ان ہی متضاد کیفیتوں کی ٹکر یا جدوجہد کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ خاتمہ اور نمو گزری ہوئی پرانی چیز اور پیدا ہونے والی نئی چیز کے مابین تصادم ارتقاء کے عمل کی اندرونی کیفیت ہے۔ مقداری تبدیلی جب ماہیتی تبدیلی میں بدلتی ہے تو اندر ہی اندر متضاد کیفیتوں کا یہی تضاد ہوتا رہتا ہے۔ یہی جدوجہد کارفرما ہوتی ہے۔

لینن کا قول ہے ''ارتقاء متضاد کیفیتوں کے مابین جدوجہد کا نام ہے۔'' جدلیت کے اصول کے مطابق پستی سے بلندی کی جانب ارتقاء ہم آہنگی کے طور سے نہیں ہوتا بلکہ وہ حوادث اور اشیاء کی متضاد کیفیتوں کی اندرونی جدوجہد کا اظہار ہوتا ہے۔

جدلیت کے اس اصول کے مطابق طبقاتی کشمکش موجودہ طبقہ داری سماج کی فطرت میں موجود ہے۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ سماج کے اس اندرونی تضاد پر پردہ ڈال کر یا اس کی طرف سے آنکھیں موند کر اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ نہ اصلاح

پسندوں کی چھوٹی موٹی اصلاحوں اور رعایتوں سے یہ تضاد حل ہوسکتا ہے۔ ہمیں موجودہ سماج میں طبقہ داری تضاد کی حقیقت، اس کے لازمی اور ناگزیر ہونے کو مان کر اس طبقاتی جدوجہد میں مظلوم اور محنت کش مزدور طبقے کو کامیاب بنانے کی کوشش کرنا چاہئے اور اس جدوجہد میں کامیابی سرمایہ دار طبقہ کی مکمل شکست اور اس کے ناپید ہو جانے سے ہی ہوسکتی ہے۔ اس لئے ہر وہ سیاست جو سرمایہ دار اور مزدور طبقے کے بنیادی تضاد کو خاطر میں نہ لاکر سرمایہ داروں اور مزدوروں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرے جھوٹی، رجعت پسند اور مکاری کی سیاست ہے۔ صرف وہی سیاست سچی، ترقی پسند اور انقلابی ہے جو مزدور طبقے کے مفاد کی مطابق ہو اور جس میں سرمایہ داری کے ساتھ مفاہمت بازی کا قطعی کوئی عنصر نہ ہو۔

مختصر الفاظ میں جدلی (ڈرائی لک ٹیکل) ارتقاء کے وہ اصول جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے یہ ہیں:

۱۔ فطرت کے حوادث اور واقعات نہ صرف ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں بلکہ وہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے ہر فطری حادثے یا واقعے کو سمجھنے کے لئے اس کے ماحول کو سمجھنا ضروری ہے۔

۲۔ فطرت کے حوادث اور واقعات نہ صرف ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں بلکہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ برابر متحرک ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں مسلسل تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے حوادث اور واقعات کو سمجھنے کے لئے ان کی حرکت، ان کی تبدیلی، ان کے وجود میں آنے اور مٹ جانے کے عمل کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔

۳۔ فطرت میں تبدیلی یا ارتقاء اس طرح ہوتا ہے کہ ایک شے میں رفتہ رفتہ مقداری تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ یہ تبدیلی بالآخر ایک مقام پر پہنچ کر یکایک اس چیز کی ماہیت اس کی صفت کو بدل دیتی ہے۔ اسے مقداری تبدیلی کا ماہیتی یا صفاتی تبدیلی میں بدل جانا کہتے ہیں۔ یہ ماہیتی تبدیلی بیک جست یا انقلابی طور سے ہوتی ہے۔

۴۔ فطرت کے تمام حوادث اور اشیاء میں اندرونی تضاد عمل پیرا ہوتا ہے۔ اسی اندرونی متضاد کیفیتوں کی باہمی جدوجہد سے ارتقاء ہوتا ہے۔

---☆☆☆---

۳

مادیت کا مارکسی فلسفہ

خیال پرستوں کے نزدیک دُنیا میں کوئی آفاقی اُلوہی روح یا عقلِ کُل کار فرما ہے۔ اسی کے سبب سے دُنیا وجود میں آئی ہے اور وہی فطرت میں جاری و ساری ہے۔

اس کے برخلاف مارکس کے نزدیک دنیا فی الحقیقت مادی ہے۔ دنیا میں ہونے والے مختلف حوادث و واقعات متحرک مادے کی مختلف شکلیں ہیں۔ حوادث اور واقعات ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہیں۔ ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور یہی ان کے ارتقاء کا جدلی اصول ہے۔ دنیا کا ارتقاء مادے کی حرکت کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ اس ارتقاء کے لئے کسی آفاقی روح یا کسی دیوتا کو ماننے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

قدیم یونان کے ایک فلسفی ہرقلیطس نے بھی مادیت کے فلسفہ کو اس کی ابتدائی شکل میں پیش کیا تھا۔ اس کے قول کے مطابق ''دنیا کو وہ ایک جس میں سب شامل ہے کسی خدا یا انسان نے خلق نہیں کیا ہے وہ تو ایک زندہ شعلہ ہے جو ہمیشہ سے موجود ہے جو ہمیشہ رہے گا اور جو مسلسل جلتا اور مسلسل بجھتا رہتا ہے۔''

مادی فلسفہ کا یہ اصول محض فطرت کے ارتقاء کو نہیں بلکہ انسانی معاشرت کے

ارتقاء کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ اس فلسفہ کی مدد سے ہم تاریخی ارتقاء کو سمجھ سکتے ہیں۔ تاریخی واقعات، بڑی بڑی تاریخی تبدیلیاں، سماج کے ارتقاء کے اصول اور قوانین کے مطابق ہوتی ہیں۔ ان قوانین کو دریافت کر کے ہم تاریخ کو بحیثیت ایک سائنس یا علم کے مرتب کر سکتے ہیں۔ یہ فلسفہ مزدوروں کی انقلابی پارٹی کو یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ سماج میں انقلاب یا تبدیلی کسی بڑے آدمی کی عظیم شخصیت، یا کسی بڑے خیال یا کسی خیالی اخلاقی نظام کو انسانی معاشرت پر عائد کرنے کی کوشش سے نہیں ہوتی۔ بڑے آدمی یا کسی اخلاقی نظام کا ظاہر ہونا، مادی ماحول کے نتیجہ کے طور پر ہوتا ہے۔ اسی لئے سچی انقلابی سیاست اس مادی ماحول میں ارتقاء کے قانون کو دریافت کر کے اور اس قانون کے تقاضے کے مطابق عمل کر کے ہی کامیاب ہو سکتی ہے۔ مثلاً بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر سرمایہ دار لالچ اور خودغرضی ترک کر دیں اور ان میں بلند اخلاقی پیدا ہو جائے اور وہ انسانوں کا درد اپنے دل میں پیدا کر لیں تو مزدور اور سرمایہ دار کا جھگڑا باقی نہ رہے گا۔ لیکن مزدوروں کی انقلابی جماعت سرمایہ داری نظام کے ارتقاء اور اس کے قوانین یعنی اس کی مادی بنیادوں کا علم حاصل کر کے اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد ہی مزدور کے کام کی طاقت کے استحصال پر قائم ہے۔ اس لئے سرمایہ داروں کو اخلاق کے اصول سکھانے کی کوشش کرنا ایسا ہے جیسا آگ سے یہ توقع کرنا کہ وہ جلانا چھوڑ دے۔ اس لئے مزدور جماعت سرمایہ داری کو سدھارنے کی تمام کوششوں کو غلط سمجھتی ہے اور سرمایہ داری نظام کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے ہی کو سچی اور عملی سیاست سمجھتی ہے۔

اس بنیادی سوال کے بارے میں کہ انسانی شعور، انسانی خیالات وتصورات، انسانی فکر اور انسانی ذہن کی تمام تخلیقات کس طرح وجود میں آئے۔ مارکس کا فلسفیانہ نظریہ خیال پرستوں سے بالکل جداگانہ ہے۔ خیال پرستوں کے نظریہ کا متضاد ہے۔

مارکسی فلسفہ کے نزدیک مادہ، فطرت ہماری مادی زندگی ایک مستقل اور علیحدہ وجود رکھتے ہیں۔ مارکس مادے کو اوّلین، پہلی حقیقت تسلیم کرتا ہے۔ انسانی دماغ اور ذہن مادی زندگی کی ایک شکل ہے۔ ذہن مادے کے ارتقاء کے ایک بلند درجے کا اظہار ہے۔ ذہن خیالات وتصورات اور شعور کا مادی آلہ ہے اس لئے خیالات وتصورات کو اس کی مادی بنیادوں سے علیحدہ اور مستقل کوئی خارجی حقیقت سمجھنا غلط ہے۔ ہمارا شعور اور سوچنے کی صلاحیت فی الحقیقت ہمارے جسم کے ایک مادی حصے یعنی دماغ کی پیداوار ہوتے ہیں۔ مادہ دماغ سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ دماغ خود مادے کی ایک بلند ارتقائی شکل ہے۔

خیال پرست یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا اور انسان کے متعلق بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کا علم انسان کو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ مزید برآں وہ انسانی علم کے کسی حالت میں بھی بالکل ٹھیک ہونے کے امکان کو نہیں مانتے۔ وہ بہت سی باتوں کو صرف ''استادِ ازل'' کا حصہ سمجھتے ہیں جن کے علم کی کوشش کرنا بھی انسان کے لئے فضول ہے۔

لیکن مارکس کے نزدیک دنیا، فطرت کا کوئی گوشہ، اس کا کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو معلوم نہ کیا جا سکے۔ مارکس کے نزدیک تجربہ اور عمل سے قوانینِ فطرت کا ہمیں علم ہو سکتا ہے اور تجربے کے ذریعے ہم ان کی خارجی حقیقت، ان کی اصلیت کو ثابت بھی کر سکتے ہیں۔ ناقابل معلوم کوئی شے نہیں ہے۔ ہاں بہت سی اشیاء کا ہمیں علم نہیں ہے لیکن سائنس اور تجربے کی وجہ سے ان نامعلوم اشیاء کا بھی ہمیں علم ہوتا جائے گا۔

مثلاً وہ کیمیائی اجزاء جن سے مل کر نباتاتی یا حیوانی اجسام کی تشکیل ہوتی ہے مدتوں تک نامعلوم ہے۔ لیکن جب علمِ کیمیا (کیمسٹری) نے ان اجزاء میں سے کئی کو اس طرح [illegible] دریافت کر لیا کہ وہ پھر [illegible] الگ بنائے جا سکیں تو ان اجزاء کا ہمیں علم ہو گیا۔ مثلاً بعض [illegible] پہلے صرف [illegible] سے نکالے جا سکتے تھے۔ اب اس

رنگ کی ماہیت معلوم کر کے انہیں کول تار سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہمیں ان رنگوں کا مکمل علم ہو گیا۔

اسی طرح مشہور عالم کوپرنیکس نے نظامِ شمسی کے متعلق ایک نظریہ پیش کیا۔ کئی سو برس بعد جب فرانسیسی عالم توڑلیے نے اسی نظریے کی بنیاد کو صحیح تسلیم کر کے ایک ایسے ستارے کے وجود کو نہ صرف دریافت کر لیا جو کہ اس سے پہلے نامعلوم تھا بلکہ حساب لگا کر آسمان پر اس کی صحیح پوزیشن بھی بتادی اور جب ایک دوسرے عالم گالے نے اس ستارے کو دریافت کر کے دکھا بھی دیا تب کوپرنیکس کے نظامِ شمسی کا نظریہ ٹھیک ثابت ہو گیا۔

جس طرح ہمیں قوانینِ فطرت کا علم ہوتا ہے اور وہ ایک خارجی حقیقت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح انسانی معاشرت یا سماج کے ارتقاء کے قوانین بھی معلوم کئے جا سکتے ہیں اور خارجی حقیقت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس لئے مزدوروں کی انقلابی پارٹی کا فرض ہے کہ وہ اپنے عمل کی بنیاد کسی ہوائی بات پر نہ رکھے بلکہ سماجی ارتقاء کی خارجی حقیقت کو برابر معلوم کرتی رہے اور اس کے مطابق عمل کرے۔

مارکس سے پہلے بھی بہت سے مفکروں اور پیشواؤں نے انسانی بہبود کے لئے ایک بہتر سماج کے نقشے اور خاکے تیار کئے۔ ان سب کو ہم خیالی یا ہوائی اشتراکیت (سوشلزم) کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے ان کی بنیاد سماجی تشکیل کے فہم اور سماجی ارتقاء کے قوانین کے علم پر نہیں تھی۔ وہ انسانیت کی بہتری کے خوشنما خواب تھے۔ مارکسی سوشلزم یا اشتراکیت کو عملی سوشلزم یا علمی اشتراکیت اس لئے کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد موجودہ سرمایہ دارانہ سماج میں عمل پیرا قوانین یا معاشرت کی خارجی حقیقت کے علم پر رکھی گئی ہے۔ اس لئے مارکس کے اصول کو ماننے والی مزدوروں کی انقلابی

جماعت اپنے نظریوں کی بنیاد سماج کی موجودہ ساخت سماج کے اندر کارفرما معاشی طاقتوں، سماج کے اندر مختلف طبقوں کی اصلی حیثیت اور ان مختلف طبقوں کے تصورات وغیرہ کے علم میں رکھتی ہے۔ اس کے انقلابی عمل اور اس کے انقلابی نظریوں میں اتحاد ہوتا ہے۔

مارکس کا یہ نظریہ کہ انسانوں کا شعور یعنی ان کی سمجھ، ان کے تصورات، خیالات، عقائد وغیرہ دراصل انسانوں کے مادی حالاتِ زندگی کا نتیجہ ہوتے ہیں بہت بڑی انقلابی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر ہم لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مادی حالاتِ زندگی میں تبدیل ہو جانے سے انسانوں کے ذہنی حالات میں بھی (یعنی ان کے شعور، خیالات، عقائد و تصورات میں تبدیلی ہوتی ہے۔ اس سے پھر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سماج میں بنیادی انقلابی تبدیلی کسی بڑے آدمی یا پیشوا یا کسی بڑی روحانی تحریک کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ خیالات، عقائد، بڑے آدمیوں کی جاری کی ہوئی سیاسی اور روحانی تحریکیں، مادی زندگی میں تبدیلی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس لئے مزدوروں کی انقلابی پارٹی کبھی کسی فرد یا اس کے دماغ سے نکلے ہوئے خیالات یا ہوائی قسم کی روحانی تحریکوں اور خیالی اسکیموں کو اپنے عمل کی بنیاد نہیں بناتی۔ وہ سماج کی اصل مادی حالت پر نظر رکھتی ہے۔ ان مادی حالات کے تقاضوں کو سمجھ کر اپنے سیاسی عمل کا پروگرام مرتب کرتی ہے۔ وہ معلوم کرتی ہے کہ سماج کی مادی ترقی کے ایک خاص حالت اور وقت میں کیا تقاضے ہیں اور پھر اپنے عمل سے ان ضروری تبدیلیوں کو جلد از جلد پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے جن کا سماج خود متقاضی ہے۔

مارکس اور لینن کے اصولوں پر چلنے والی جماعت کی دنیا بھر میں روز افزوں ترقی کا راز یہ ہے کہ وہ کبھی سماج کی مادی ترقی کی ضرورتوں اور معاشرتی تقاضوں سے اپنے کو علیحدہ نہیں کرتی۔ وہ سماج کی اصلی زندگی سے پیوست رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ

روز بروز طاقت پکڑتی ہے۔ بعض دوسری جماعتیں جو ترقی پسند ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں اور نہایت خوشنما لائحہ عمل اور بلند ترین نصب العین لوگوں کے سامنے پیش کرتی ہیں ترقی نہیں کرتیں اور فنا ہو جاتی ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ان کا پروگرام خیالی ہوتا ہے۔ وہ نہ تو سماج کی ساخت نہ اس کی مادی بنیادوں اور نہ سماج میں مادی تبدیلیوں کے اسباب کو سمجھتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے نیک ارادوں کے باوجود تاریخی قوتیں انہیں بے بس اور بے کار بنا کر رکھ دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مٹ جاتی ہیں۔ لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ سماجی نظریوں، سیاسی عقائد اور نصب العین کو مارکسی کوئی اہمیت نہیں دیتے، اور نہ مارکسی یہ کہتے ہیں کہ سماجی نظریے، تصورات اور عقائد وغیرہ سماج کے ارتقاء پر اثر نہیں ڈالتے۔ مارکس نے جہاں سماج کی ذہنی اور روحانی زندگی کے مخرج (جہاں سے وہ پیدا ہوتی ہے) کا ہمیں سراغ بتایا ہے وہاں اس نے اس ذہنی اور روحانی زندگی، یعنی انسانوں کے نظریوں، تصورات اور عقائد وغیرہ کی تاریخی اہمیت پر بھی زور دیا ہے۔

خیالات اور معاشرتی نظریے مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ترقی پسند یا رجعت پرست۔ رجعت پرست نظریے یا خیالات وہ ہیں جو ان طبقوں، گروہوں اور طاقتوں کی ترجمانی کرتے ہیں جو سماج کو آگے بڑھنے سے روکنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ پرانے نظریے ہیں جو انسانی ذہن پر اس طرح اثر ڈالتے ہیں کہ وہ ترقی کی قوتوں کے مخالف بن کر سماج کے راستے میں رکاوٹ بن جائیں۔

نئے ترقی پسند نظریے یا خیالات وہ ہیں جو ان طبقوں، گروہوں اور طاقتوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جو سماج کو آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ نئے نظریے سماج کی مادی ترقی میں مدد دیتے ہیں۔ جس حد تک یہ نظریے سماج کی مادی ترقی کے تقاضوں کا اظہار کرتے ہیں جس حد تک کہ ان میں یہ اظہار صحیح، حقیقی اور سچا ہوتا ہے اس حد تک

ان کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے اور اس حد تک ان کا سماجی اثر زیادہ ہوتا ہے۔

نئے معاشرتی نظریے اور تصورات اس وقت وجود میں آتے ہیں۔ جب سماج کی مادی زندگی بنیادی تبدیلیوں کی متقاضی ہوتی ہے۔ لیکن ایک بار وجود میں آ جانے کے بعد یہ نئے ترقی پسند نظریے جب عوام میں پھیل جاتے ہیں۔ جب عوام انہیں قبول کر لیتے ہیں تو وہ لوگوں کو متحد کرنے انہیں منظم کرنے اور منظم طور پر انقلابی عمل کرنے میں اور ان تبدیلیوں کو پیدا کرنے میں جو سماج کے لئے ضروری ہو چکی میں بے حد مفید اور مددگار ہوتے ہیں۔ یہ نئے نظریے عوام کے عقائد اور تصورات بن کر پرانے نظریوں کی ان مجہول اور نقصان دہ حد بندیوں کو جو سماج کو آگے بڑھنے اور پرانے نظام کو گرا کر نئی مادی زندگی کی تعمیر کرنے سے روکتی ہیں توڑ دیتے ہیں۔

یہ نئے نظریے پرانے مادی حالات زندگی کے اندرونی تضاد سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن وہ نئی زندگی کے علمبردار ہوتے ہیں۔ نئی زندگی کے قیام کی جدوجہد یعنی ان ضروری اور لازمی حالاتِ زندگی کے قیام کی جدوجہد جن کے بغیر معاشرت کا ارتقاء ممکن نہیں ہے۔ ان نظریوں کی مدد سے سہل ہو جاتی ہے۔ پرانے مادی حالات کی ضرورتیں نئے نظریوں کو جنم دیتی ہیں۔ پھر یہ نظریہ نئے مادی حالاتِ زندگی کو جنم دینے میں مدد دیتے ہیں۔ مارکس نے کہا ہے۔ "عوام کے دل و دماغ میں گھر کر لینے کے بعد نظریہ ایک مادی طاقت بن جاتا ہے۔" اس لئے ضروری ہے کہ مزدوروں کی انقلابی جماعت معاشرت کے ایک ایسے نظریے کو اپنائے جو معاشرت کی مادی ترقی کے تقاضوں کی صحیح طور سے ترجمانی کرتا ہو۔ ایسا نظریہ عوام کو متحد، منظم اور متحرک کر دے گا۔ اور اس نظریے کی مدد سے عوام زندگی کے ضروری ارتقاء کی رفتار کو اپنے عمل کے ذریعے تیز کر سکیں گے۔ اس کی مدد سے وہ سماج کی مادی حالت کو بہتر بنا سکیں گے۔ سماج میں بنیادی اور انقلابی تبدیلیاں پیدا کر سکیں گے۔ اس نظریہ کی مدد سے

عوام اپنی منتشر صفوں کو ایک ایسی زبردست منظم فوج میں بدل سکیں گے جو رجعت پرست طاقتوں کے قلعے کو ڈھا کر ترقی کی قوتوں کے آگے بڑھنے کے لئے راستہ کھول دے گی۔

یہی سبب ہے کہ اشتراکی اپنی جماعت اور محنت کش عوام میں صحیح نظریے کی ترویج کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ وہ غلط اور بے بنیاد ہوائی نظریوں کو رجعت پرستی کا آلہ اور مارکس اور لینن کے نظریوں کو انقلاب اور ترقی پسندی کی قوتوں کا آلہ سمجھتے ہیں۔ اول الذکر نظریے غلط ہیں۔ اس لئے کہ انہیں معاشرت کی مادی زندگی کے حقائق اور اس کے ارتقاء کی ضرورتوں سے سروکار نہیں۔ مؤخر الذکر نظریے سچے ہیں اور انقلابی ہیں۔ اس لئے کہ ان کی بنیاد معاشرت کی مادی زندگی کے موجودہ تقاضوں پر ہے۔ وہ ان مادی تبدیلیوں کا اظہار کرتے ہیں جن کے لائے بغیر زندگی ترقی نہیں کر سکتی۔ ان نظریوں سے مسلح ہو کر مزدوروں کی انقلابی پارٹی حیات و نمو کی طاقتوں کا ہراول دستہ بن جاتی ہے۔

مختصر الفاظ میں مارکس کے مادی فلسفہ کے اصول جن کا ہم نے اس باب میں ذکر کیا، یہ ہیں:

۱۔ دنیا کی اصل مادی ہے۔ دنیا میں ہونے والے مختلف حوادث متحرک مادے کی مختلف اشکال ہیں۔ دنیا میں ارتقاء مادے کی حرکت کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کے لئے کسی آفاقی طاقت کو تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں۔

۲۔ ہمارے ذہن اور دماغ اور اس سے نکلے ہوئے خیالات، تصور، احساسات وغیرہ بالفاظ دیگر انسانی شعور، سب ہماری مادی زندگی کی آئینہ داری کرتے ہیں اور اسی

سے نکلے ہیں۔ مادی زندگی، مادی وجود اولین، بنیادی حیثیت اور ذہنی زندگی تصورات، احساسات وغیرہ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

۳۔ دنیا میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جس کی ماہیت معلوم نہ کی جا سکے۔ تجربے اور عمل سے ہر چیز کا علم ہو سکتا ہے۔ جن چیزوں کا علم ہمیں ابھی تک نہیں ہے وہ بھی معلوم کی جا سکتی ہیں۔

......☆☆☆......

۴

تاریخی مادیت

یا

تاریخ کی ارتقاء کے اصول

اوپر ہم یہ لکھ آئے ہیں کہ سماج کی مادی زندگی کے حالات ہی وہ بنیاد ہیں جن پر کہ کسی سماج میں مروجہ خیالات وعقائد، اس کے سیاسی اداروں اور اس کی پوری ہیئت کا انحصار ہوتا ہے۔ اب ہمیں سماج کے ان مادی حالاتِ زندگی کی تشریح کرنا ہے اور دیکھنا ہے کہ ان کی کیا خصوصیتیں ہیں۔

سماج کے مادی حالاتِ زندگی میں جغرافیائی ماحول ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ کسی ملک یا خطے کی آب وہوا، اس کے نباتات و جمادات، اس کی زمینی اور معدنی حالت وغیرہ اس ملک یا خطے کے رہنے والوں کی معاشرت پر ضرور اپنا اثر ڈالتی ہے۔ لیکن کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جغرافیائی حالت انسانی معاشرت یا سماج کے ارتقاء، سماج کی شکل وہیئت میں تبدیلیوں کے پیدا ہونے کا بنیادی سبب ہو سکتی ہے؟ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جغرافیائی ماحول سے ہی وہ طاقت پیدا ہوتی ہے جس کے عمل میں

آنے سے ایک خاص قسم کا معاشرتی نظام بدل جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا معاشرتی نظام لے لیتا ہے؟

تاریخی مادیت کا اصول ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہم ایسا نہیں کہہ سکتے۔

جغرافیائی ماحول یقینی طور پر سماج پر ایک مستقل قسم کا اثر ڈالتا ہے۔ جغرافیائی ماحول سے سماج کے ارتقاء پر بھی اثر پڑتا ہے۔ وہ ارتقاء کی رفتار کو تیز یا سست کر سکتا ہے۔ لیکن جغرافیائی ماحول نظامِ معاشرت کے ارتقاء اور اس میں تبدیلی کا سب سے اہم اور فیصلہ کن سبب نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ معاشرت میں تبدیلی، جغرافی ماحول میں تبدیلی کے مقابلے میں بہت جلد ہوتی ہے۔ اگر ہم انسان کی گزشتہ تین ہزار سال کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ اس مدت میں معاشرت کے کئی نظام پیدا ہوئے۔ قدیم اشتراکی نظام، غلامی کا نظام، جاگیرداری کا نظام، سرمایہ داری کا نظام اور اب بعض جگہوں پر اشتراکی نظام قائم ہے۔ سوویت یونین کی اقوام ان تمام نظاموں کے دَور سے گزر کر اب اشتراکی نظام کے دَور میں ہیں۔ ہمارے پاکستان اور ہندوستان میں قدیم اشتراکی نظام اور غلامی کا نظام بالکل مٹ چکا ہے۔ جاگیرداری کا نظام انحطاط پذیر ہے اور سرمایہ داری کا نظام بیرونی سامراج کے ڈھانچے کے اندر قائم ہے۔ لیکن اس مدت میں ان ملکوں کے فطری جغرافی ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ جغرافی ماحول میں تبدیلیاں لاکھوں برس میں ہوتی ہیں لیکن سماجی تبدیلیاں چند صدیوں میں یا اس سے بھی جلدی ہو جاتی ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم جغرافیائی ماحول کو سماجی ارتقاء کا فیصلہ کن عنصر نہیں کہہ سکتے۔ جو چیز ہزاروں اور لاکھوں سال تک نہ بدلے وہ ان بنیادی معاشرتی تبدیلیوں کا سبب کیسے ہو سکتی ہے جو چند سو سال کے اندر ہو جاتی ہیں۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا کسی ملک یا خطہء زمین کی آبادی جو یقینی سماج کے مادی حالاتِ زندگی کا ایک عنصر ہے، معاشرتی ارتقاء یا تبدیلی پر فیصلہ کن اثر ڈالتی ہے یا نہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ آبادی کے کم یا زیادہ ہونے سے سماجی ارتقاء پر ضرور اثر پڑتا ہے۔ انسان مادی حالاتِ زندگی کا ایک ضروری عنصر ہیں۔ اس لئے کسی ملک کی آبادی میں کمی یا زیادتی سے سماج کے مادی حالات پر اثر پڑے گا۔ لیکن تاریخی مادیت کی رو سے آبادی بھی سماجی ارتقاء پر فیصلہ کن اثر نہیں ڈالتی۔ آبادی کی کمی یا زیادتی سے ہمیں اس بات کا سبب نہیں معلوم ہوگا کہ قدیم اشتراکیت کی جگہ غلامی پر قائم معاشرت نے کیوں لے لی اور غلامی کا نظام بدل کر جاگیری کا نظام کیوں قائم ہوا۔ جاگیری نظام توڑ کر سرمایہ داری کا نظام کیوں آیا اور سرمایہ داری کی جگہ اشتراکیت کیوں لے رہی ہے؟

اگر آبادی کے بڑھنے سے ہی سماج میں ارتقاء ہوتا تو پھر ہندوستان یا مشرقی پاکستان مادی ترقی کے اعتبار سے امریکہ سے آگے بڑھا ہوا ہوتا۔ اس لئے کہ ہندوستان اور مشرقی پاکستان میں امریکہ کے مقابلے میں زیادہ گھنی آبادی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ امریکہ میں سرمایہ داری کا نظام ہے اور ہمارے ہاں اب تک جاگیرداری یا نیم جاگیرداری کا نظام ملک کے بہت بڑے حصے میں پھیلا ہوا ہے جو کہ سرمایہ داری کے مقابلے میں پچھڑی ہوئی معاشرت ہے۔ اس طرح ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی آبادی سوویت یونین کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ گھنی ہے لیکن وہاں کا معاشرتی نظام (سرمایہ داری) سوویت یونین کے معاشرتی نظام (اشتراکیت) کے مقابلے میں پچھڑا ہوا ہے۔

اس لئے آبادی کی زیادتی سماج کی ترقی کے لئے فیصلہ کن طاقت کی حیثیت نہیں

رکھتی۔ وہ سماج کی ہیئت کے متعین کرنے میں بنیادی حیثیت نہیں رکھتی۔

مادی حالات زندگی کے متعدد اسباب میں سے وہ کون سی خاص طاقت ہے جو سماج کی ہیئت، اس کی خاصیت، ایک قسم کی معاشرت کے دوسری قسم کی معاشرت میں ارتقاء کو متعین کرتی ہے اور اس کا سب سے بڑا اور اہم سبب ہوتی ہے۔

تاریخی مادیت کی رو سے یہ طاقت ان وسائل اور طریقوں کی ہے جو انسانی زندگی کے لئے ضروری سامانِ معیشت مہیا کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

مثلاً زندہ رہنے کے لئے کھانے، کپڑے، جوتے، مکان، ایندھن، آلات و اوزار وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مادی چیزیں انسان کی زندگی کو قائم رکھنے اور اس کے ارتقاء کے لئے بالکل ضروری ہیں۔ جن وسائل کو ان ضروری عادی اقدار کے پیدا کرنے اور بنانے کے لئے استعمال کیا جائے انہیں وسائل پر سماج کی ہیئت اور اس کے ارتقاء اور معاشرتی نظام میں تبدیلیوں کا انحصار ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کو قائم اور برقرار رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان کھانا، کپڑا، مکان، ایندھن وغیرہ پیدا کریں یا بنائیں۔ ان مادی چیزوں کے پیدا کرنے یا بنانے کے لئے انہیں بعض آلات واوزار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان آلات واوزار کو بھی بنا سکیں۔ اس لئے سماج کی پیداوار کی طاقتیں یہ ہیں:

اوّل: وہ آلاتِ پیداوار جو مادی چیزوں کے بنانے اور پیدا۔ کرنے کے لئے استعمال میں آتے ہیں۔

دوم: وہ لوگ جو ان آلات کو استعمال کرتے ہیں۔

سوم: ان لوگوں کا تجربہ اور کام کا ہنر جو پیداوار کے سلسلے میں بروئے کار آتا ہے۔

لیکن پیداوار کی طاقتیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا پیداوار کے جملہ وسائل اور

طریقوں کا صرف ایک پہلو ہیں۔ یہ وہ پہلو ہے جس سے انسانوں اور فطرت اور فطری طاقتوں کے مابین مادی چیزیں بنانے کے سلسلہ میں جو تعلق قائم ہوتا ہے اس کا اظہار ہوتا ہے۔

پیداوار کا ایک دوسرا پہلو انسانوں کے آپس کے تعلقات بھی ہیں جو پیداوار کے سلسلے میں ان کے مابین قائم ہوتے ہیں۔ انسان اپنی ضرورت کی مادی اشیاء پیدا کرنے کے لئے فطرت اور فطرت کی طاقتوں کے خلاف جب جدوجہد کرتے ہیں تو وہ اکیلے اکیلے اس کام کو نہیں کرتے۔ وہ فطرت کی طاقتوں کو اپنے لئے سازگار بنانے کے لئے مل جل کر گروہوں میں سماج کی حیثیت سے عمل کرتے ہیں۔ اس لئے پیداوار کے لئے عمل ہمیشہ اور ہر صورت و حالت میں سماجی عمل ہوتا ہے۔ پیداوار ہمیشہ اور ہر صورت میں سماجی پیداوار ہوتی ہے۔

انسان جب مادی چیزوں کے لئے عمل کرتے ہیں تو وہ اس سلسلہ میں ایک دوسرے سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق قائم کرتے ہیں۔ پیداوار کے سلسلے میں قائم ہونے والے ان رشتوں کو ہم ''پیداواری تعلقات'' کہہ سکتے ہیں۔

ان لوگوں کے مابین جہاں استحصال (دوسرے کی محنت سے نفع حاصل کرنا) نہیں ہوتا ہے۔ یہ تعلقات باہمی امداد اور اشتراکِ عمل کے تعلقات ہو سکتے ہیں۔

یا جہاں ایسا نہیں ہے یہ تعلقات حاکم و محکوم کے ہو سکتے ہیں۔

یا آزادی اور محکومی کے درمیان کی بدلتی ہوئی پوزیشن کے تعلقات ہو سکتے ہیں۔

بہر صورت ان پیداواری تعلقات کی جو بھی نوعیت ہو اور جس طرح کا بھی معاشرتی نظام ہو پیداواری تعلقات دونوں پر مشتمل ہیں۔ مادی اقدار کے پیداوار کے سلسلے میں، پیداوار میں ان دونوں یعنی پیداواری تعلقات اور پیداواری طاقتوں کا اتحاد ہوتا ہے۔

پیداوار کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زیادہ مدت تک ایک حالت پر نہیں رہتی۔ وہ ہمیشہ تبدیلی اور ارتقاء کی حالت میں ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ پیداوار کے وسائل اور طریقوں میں تبدیلی ہو جانے سے سارے سماجی نظام، سماجی تصورات، سیاسی خیالات اور سیاسی اداروں میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ پیداوار کے وسائل اور طریقوں میں تبدیلی پورے سیاسی عقائد و نظریوں اور سیاسی اداروں میں تبدیلی کا باعث ہو جاتی ہے۔ اپنے ارتقاء کے دوران میں انسانوں نے پیداوار کے مختلف وسائل اور طریقے استعمال کئے ہیں یا دوسرے لفظوں میں انہوں نے مختلف طریقوں سے زندگی بسر کی ہے۔ ابتدائی اشتراکیت کے دَور میں ایک طرح کے وسائل پیداوار تھے۔ نظامِ غلامی میں ایک طرح کے، اور جاگیرداری نظام میں ایک طرح کے۔ اسی کی مطابقت سے انسانوں کے سماجی نظام، ان کی ذہنی اور روحانی زندگی، ان کے سیاسی خیالات اور سیاسی ادارے بھی بدلتے رہتے ہیں۔

سماج میں جس طرح کی پیداوار کے وسائل اور طریقے رائج ہوتے ہیں اسی کے مطابق اس سماج کی ہیئت ہوتی ہے۔ اسی کے مطابق اس سماج کے مروجہ خیالات، عقائد، تصورات اور سیاسی ادارے ہوتے ہیں۔ موٹے لفظوں میں اس بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ جیسا انسان کے رہنے کا طریق ہوتا ہے ویسے ہی اس کے خیالات ہوتے ہیں۔

اب یہ بات صاف ہوگئی کہ سماج کے ارتقاء کی تاریخ دراصل پیداوار کے ارتقاء کی تاریخ ہے۔ وہ ہے پیداوار کے وسیلوں اور طریقوں کی تاریخ جو صدیوں کے بعد یکے بعد دیگرے بدلتے رہے ہیں۔ وہ تاریخ ہے پیداواری طاقتوں اور انسانوں کے مابین پیداواری تعلقات کی۔

جب تاریخ کو ہم اس نظر سے دیکھتے ہیں تو پھر ہمیں محنت کش عوام کی اہمیت کا

اندازہ ہوتا ہے۔ سماجی ارتقاء تو ممکن ہی ہوتا ہے ان لوگوں کے عمل سے جن کی محنت سے مادی اقدار پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے سماجی ارتقاء کی تاریخ دراصل مادی اقدار کو پیدا کرنے والے محنت کش عوام کی بھی تاریخ ہے جن کی محنت کے نتیجے کے طور پر وہ مادی اشیاء پیدا ہوتی ہیں یا بنتی ہیں۔ جن پر سماج کی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔

سرمایہ دار طبقے سے تعلق رکھنے والے مؤرخ انسانی تاریخ کو بڑے بڑے فاتحوں، بادشاہوں، جنرلوں اور سر برآوردہ ہستیوں کے کارناموں اور کارگزاریوں کی تاریخ بنا کر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سماجی ارتقاء انہی بڑے لوگوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لیکن ہم نے دیکھ لیا کہ یہ تاریخ کو سمجھنے کا غلط غیر علمی اور غیر سائنسی طریقہ ہے۔ تاریخ اسی وقت سچی اور علمی تاریخ کہی جا سکتی ہے جب کہ مادی اقدار کو پیدا کرنے والوں کی تاریخ محنت کش عوام کی، جنتا کی تاریخ ہو۔

اب یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ سماجی تاریخ کے قوانین اور اصول کا مخرج انسانوں کے ذہن میں یا سماج کے متعلق ان کے خیالات و تصورات میں تلاش کرنا غلط ہے۔ سماجی تاریخ کے ارتقاء کے قوانین ہم کو جب ہی معلوم ہو سکتے ہیں جب ہم ایک خاص عہد میں اس سماج میں مروجہ وسائل پیداوار پر نظر ڈالیں اور اس سماج کی معاشی زندگی کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں۔

اس لئے علم تاریخ کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ پیداوار کے قوانین دریافت کرے۔ وہ یہ معلوم کرے کہ پیداواری طاقتوں کا ارتقاء کیسے ہوتا ہے۔ وہ پیداوار کے سلسلے میں انسانوں کے باہمی تعلقات پر نظر ڈالے اور اس طرح سماج کے معاشی ارتقاء کے تمام اصولوں کو معلوم کرے۔

ان تمام باتوں کے مدِنظر مزدوروں کی انقلابی پارٹی کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ موجودہ سماج اور موجودہ عہد میں پیداوار کے ارتقاء کے قوانین و اصول کے

متعلق پورا پورا علم حاصل کرے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ سماج کے معاشی ارتقاء کے قوانین دریافت کرکے ان پر عبور حاصل کرے۔ ایسا ہی کرنے سے مزدوروں کی پارٹی کا پروگرام اور اس کا عمل صحیح اور مئوثر ہو سکتا ہے اور وہ غلطیوں سے بچ سکتی ہے۔

پیداوار کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تبدیلی اور ارتقاء پیداواری طاقتوں میں تبدیلی اور ارتقاء سے شروع ہوتا ہے اور سب سے پہلے آلات اور اوزارِ پیداوار میں تبدیلی اور ارتقاء ہوتا ہے۔ اس لئے پیداوار میں سب سے زیادہ انقلابی عنصر پیداواری طاقتوں کا ہوتا ہے۔

سماج میں جب تبدیلی اور ارتقاء ہوتا ہے تو پہلے پیداواری طاقتیں بدلتی ہیں اور پھر اس تبدیلی کے بعد اسی کے سبب سے اسی کے مطابق انسانوں کے پیداواری اور معاشی تعلقات بھی بدلتے ہیں۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسانوں کے معاشی یا پیداواری تعلقات پیداواری طاقتوں کے ارتقاء پر اثر نہیں ڈالتے۔ یہ صحیح ہے کہ انسانوں کے پیداواری تعلقات کا انحصار ان کی بنیاد پیداواری طاقتوں کے ارتقاء پر ہوتا ہے۔ لیکن وہ بھی اپنی جگہ پر ان پیداواری طاقتوں پر اثر ڈال کر ان کے ارتقاء کی رفتار کو تیز یا سست کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔

چونکہ یہ ضروری ہے کہ انسانوں کے پیداواری تعلقات پیداواری طاقتوں کی تبدیلیوں اور ارتقاء کے مطابق ہوں۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ پیداواری طاقتوں میں تبدیلی ہو جانے کے بعد زیادہ مدت تک انسانوں کے پیداواری تعلقات، پیداواری طاقتوں کی نئی تبدیل شدہ حالت سے مطابقت نہ کریں اور ان سے متضاد ہوں۔ نئی پیداواری طاقتوں کی بھرپور ترقی پرانے پیداواری تعلقات کے قیام کے ساتھ مشکل

ہو جاتی ہے۔ یہ متضاد اور غیر مطابق تعلقات اس کے ارتقاء میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ اس لئے پیداواری تعلقات میں نئے تقاضوں کے مطابق تبدیلی ہونے میں دیر لگ سکتی ہے۔ ان میں تبدیلی پیداواری طاقتوں کے ارتقاء کے مقابلے میں سست رفتار سے ہو سکتی ہے۔ لیکن جلد یا بدیر ان کی تبدیلیوں میں پیداواری طاقتوں کی ترقی کے ساتھ مطابقت پیدا ہونا لازمی اور لابدی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو پیداواری طاقتوں اور پیداواری تعلقات میں بنیادی اتحاد قائم نہیں رہے گا۔ اور پیداوار کے پورے نظام میں سخت بحران ہوگا۔ جو پیداواری طاقتوں کو کمزور کردے گا۔

اس قسم کی مثال ہمیں موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں ملتی ہے۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ پیداواری تعلقات پیداواری طاقتوں کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے۔ اس سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ سرمایہ دار سماج میں بڑی صنعتوں میں پیداوار انسانوں کے مشترک عمل کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ لیکن ان ذرائع پیداوار (صنعتوں) پر ملکیت انفرادی ہے۔ یعنی پیداواری طاقت کے مشترک عمل اور ان پر انفرادی ملکیت میں تضاد ہے۔ پیداواری تعلقات پیداواری طاقت کے مطابق نہیں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ سماج معاشی بحران کا شکار رہتا ہے اور پیداوار کی طاقتیں بڑھنے کی بجائے ضائع، کمزور اور برباد ہوتی جاتی ہیں۔ اسی تضاد اور غیر مطابق حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ سماج کے پیداواری تعلقات میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ لوگ ایسے سماجی انقلاب کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جو پرانے پیداواری تعلقات کو ختم کر کے ایسے نئے تعلقات قائم کرے جو موجود پیداواری طاقتوں سے ہم آہنگ اور ان کے مطابق ہوں۔

سوویت یونین کے اشتراکی سماج میں ایسا ہی ہے۔ وہاں پیداواری طاقتوں کی مشترکہ ملکیت یعنی پیداواری تعلقات مشترک عمل پر قائم پیداواری طاقتوں کے

مطابق اور ہم آہنگ ہے۔ اسی وجہ سے سوویت کا سماج معاشی بحران کا شکار نہیں ہوتا اور وہاں سرمایہ دارانہ سماج کی طرح پیداواری طاقتوں کو ضائع اور برباد نہیں کیا جاتا۔

خلاصہ یہ کہ پیداواری طاقتیں، پیداوار کے سلسلہ میں سب سے زیادہ انقلابی ہوتی ہیں، اور پیداوار کے ارتقاء میں ان کی حیثیت فیصلہ کن ہوتی ہے۔ مزید برآں انسانوں کے مابین پیداواری تعلقات کا انحصار بھی ان ہی قوتوں پر ہوتا ہے اور وہ ان ہی کے مطابق ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہمارے سامنے دو سوال اور پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ انسان اپنی ضرورت کی مادی چیزیں پیداوار کے کن اوزار و آلات سے پیدا کرتے ہیں؟ اس سوال کا جواب ہمیں پیداواری طاقتوں کے مشاہدے سے ملتا ہے۔

دوسرے یہ کہ ذرائع پیداوار (یعنی زمین، جنگل، دریا، معدنیات خام اشیاء، کارخانوں، مشینوں یعنی آلاتِ پیداوار، ذرائع آمدورفت اور رسل و رسائل وغیرہ پر ملکیت کس کی ہے۔ پورے سماج کی یا افراد، گروہوں اور طبقوں کی جو انہیں دوسرے افراد، گروہوں اور طبقوں کے استحصال کے لئے استعمال کرتے ہیں؟

وہ اوزار و آلات جو انسانوں نے عہدِ قدیم سے لے کر اس زمانے تک اپنی مادی ضرورت کی چیزیں پیدا کرنے کے لئے استعمال کئے، یہ ہیں۔ ان اوزاروں میں تبدیلی سے پیداواری طاقتوں کے بتدریج ارتقاء کا بھی ہمیں اندازہ ہوتا ہے۔

سب سے پہلے انسانوں نے پتھر کے اوزار بنائے۔ اس کے بعد تیر کمان۔ اس کے ساتھ معاشرت میں یہ تبدیلی ہوئی کہ وہ شکاریوں کی زندگی کے دور سے نکل کر مویشی رکھنے اور گلہ بانی کے دورِ معاشرت میں آ گئے۔

اس کے بعد انہوں نے پتھر کے اوزاروں کی جگہ دھاتوں کے اوزار بنانا اور استعمال کرنا شروع کیا۔ ان دھاتوں کے اوزار میں کلہاڑا اور ابتدائی قسم کا ہل جس

میں لوہے کا پھل لگا ہوا تھا اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ وہ ابتدائی قسم کی زراعت (جو ہاتھ سے زمین کھود کر ہوتی تھی) کے بدلے ہل اور مویشی کے ذریعے زراعت کرنے لگے۔

اس کے بعد انہوں نے دھات کے اور دوسرے اور بہتر اوزار بنائے۔ پھر لوہار کی دھونکنی کی ایجاد ہوئی اور مٹی کے برتن بنائے جانے لگے۔ اس کے نتیجہ کے طور پر دستکاری کی چیزیں بنائی گئیں دستکاری اور زراعت دو الگ الگ فن ہو گئے۔ دست کاری کی صنعتوں کا مستقل ارتقاء ہوا اور بعد میں صنعتیں وجود میں آئیں۔

دستکاری کے اوزار کے بعد مشینوں کی ایجاد ہوئی اور دستکاری صنعت کی جگہ مشینی صنعت قائم ہوئی۔

مشینی صنعت کے بعد بڑے پیمانے کی مشینی صنعتیں وجود میں آئیں۔

ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اوزار پیداوار میں تبدیلی اور ارتقاء ان انسانوں نے کیا جو پیداوار سے تعلق رکھتے تھے اور یہ سمجھنا کہ یہ تبدیلی کسی ایسے سبب سے ہوئی جو انسانوں سے الگ ہے غلط ہوگا۔

پیداوار کے اوزار میں تبدیلی اور ارتقاء کے ساتھ ساتھ انسانوں میں بھی تبدیلی ہوئی اور ان کا بھی ارتقاء ہوا۔ انسانوں کا پیداوار کا تجربہ بڑھا۔ ان کے کام کرنے کے ہنر میں اور اوزارِ پیداوار کے استعمال کی صلاحیت میں اضافہ ہوا۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ پیداواری طاقتوں کے ارتقاء کے مطابق تاریخ میں انسانوں کے پیداواری یا باہمی معاشی تعلقات کا بھی ارتقاء ہوتا ہے اور ان میں بھی تبدیلی ہوتی ہے۔

دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ارتقاء کے دوران میں خاص طور پر پانچ قسم کے پیداواری تعلقات یا معاشی نظاموں کا وجود ہوا ہے:

۱۔ قدیم اشتراکی نظام
۲۔ غلامی کا نظام
۳۔ جاگیری نظام
۴۔ سرمایہ دارانہ نظام
۵۔ سوشلسٹ یا اشتراکی نظام

۱۔ قدیم اشتراکی نظام:

قدیم اشتراکی نظام میں پیداوری تعلقات کی بنیاد یہ ہے کہ ذرائع پیداوار پر ملکیت پورے سماج کی ہوتی ہے۔ یہ معاشی تعلقات اس دَور کی پیداواری طاقتوں کے مطابق تھے۔ پتھر کے اوزار اور اس کے بعد تیر کمان انسان کے آلاتِ پیداوار کا اس زمانے میں سارا اثاثہ تھا۔ اگر انسان مشترک طور پر ان کی مدد سے فطرت کی طاقتوں اور جنگلی جانوروں کا مقابلہ نہ کرتے تو ان کے لئے زندہ رہنا ممکن نہ ہوتا۔ جنگل سے پھل جمع کرنے، مچھلی پکڑنے، اپنے رہنے کے لئے گھاس پھونس اور پتوں کا گھر بنانے کے لئے انسان کو مل جل کر کام کرنا ضروری تھا۔ مل جل کر ہی وہ اپنے کو جنگلی جانوروں سے اور ہمسایہ اجنبی قبیلوں سے بچا سکتے تھے۔ ساتھ مل کر کام کرنے کی وجہ سے اوزار پیداوار پر ملکیت بھی مشترک ہوتی تھی اور اسی وجہ سے مشترک محنت کا پھل بھی مشترک ملکیت ہوتا تھا۔ اس سماج میں ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت کا تصور پیدا نہیں ہوا تھا۔ سوائے اس کے کہ بعض اوزار پیداوار جن کی مدد سے جنگلی جانوروں کا مقابلہ کیا جاتا تھا، ذاتی ملکیت تھے۔ اس سماج میں نہ تو انسان دوسرے انسانوں کا استحصال کرنے سے اور نہ اس میں طبقہ داری تقسیم تھی۔

۲۔ غلامی کا نظام:

غلامی کے نظام میں پیداواری تعلقات کی بنیاد یہ ہے کہ اس میں غلاموں کا مالک یا آقا ذرائع پیداوار کا بھی مالک ہوتا تھا۔ وہ اس محنت کش انسان کا مالک ہوتا ہے جس کی محنت سے چیزیں پیدا ہوتی ہیں، وہ اس غلام سے کام لے سکتا ہے۔ اسے بیچ یا خرید سکتا ہے، یہاں تک کہ اسے ایک جانور کی طرح قتل بھی کرنے کا حق رکھتا ہے۔

یہ پیداواری یا معاشی تعلقات اس دَور کی پیداواری طاقتوں کے مطابق تھے۔ اس دَور میں بجائے پتھر کے اوزار کے انسانوں نے دھات کے اوزار بنائے تھے۔ اب وہ شکار کھیل کر بسر اوقات نہیں کرتے تھے، بلکہ غلہ بانی، بونا اور اُگانا، دست کاری بھی کر سکتے تھے۔ پیداور کے ان مختلف شعبوں میں محنت کی تقسیم بھی ہو گئی تھی۔ اب اس کا امکان تھا کہ ایک فرد جو چیزیں بنائے اسے سماج میں دوسری چیزوں سے تبادلہ کے لئے پیش کرے۔ ایک سماج میں بنی ہوئی یا پیدا ہوئی چیزوں کا دوسرے سماج کی چیزوں کے ساتھ تبادلہ بھی ہو سکتا تھا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ سماج میں بعض افراد یا ایک اقلیت ذرائع پیداوار کو جمع کر کے ان پر قبضہ کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ امکان بھی ہو گیا کہ انسانوں کی اقلیت ان کی اکثریت کو اپنا غلام بنا لے۔ اس سماج میں اس کے تمام افراد آزاد اور مشترک طور پر پیداوار کے عمل میں حصہ نہیں لیتے بلکہ آقاؤں کی اقلیت جو خود کام نہیں کرتی، غلاموں کی اکثریت سے زبردستی کام لیتی ہے۔ یہاں نہ ذرائع پیداوار اور نہ پیداوار کے پھل پر مشترک ملکیت ہے ذاتی ملکیت کا وجود ہو گیا اور غلاموں کا آقا ہی تمام چیزوں کا مالک ہو گیا۔ اب امیر اور غریب وجود میں آئے۔ ایک طرف وہ چھوٹا سا گروہ تھا جو استحصال کرتا تھا۔ دوسری

طرف محنت کرنے والوں کی اکثریت جن کا استحصال ہوتا تھا۔ ایک طرف وہ تھے جو تمام حقوق کے مالک تھے۔ دوسری طرف وہ تھے جن کا کوئی حق نہ تھا۔ ان دونوں طبقوں میں کشاکش اور کسی نہ کسی شکل میں باہمی لڑائی نے مستقل شکل اختیار کرلی۔

۳۔ جاگیری نظام:

جاگیری نظام میں پیداواری تعلقات کی بنیاد یہ ہے کہ جاگیردار، راجہ، نواب، ذرائع پیداوار کا تو مالک ہوتا ہے لیکن مزارع یا کاشتکار پر اس کی ملکیت پوری نہیں ہوتی۔ وہ ایک غلام کی طرح اسے مار نہیں سکتا۔ لیکن اسے خریدنے اور بیچنے کا حق ہوتا ہے اور جہاں جاگیردار کے جاگیرانہ حقوق ہوتے ہیں اسی کے ساتھ ساتھ کاشتکار یا دستکار (جو اس کی جاگیر پر رعایا کے طور پر رہتا ہے) اپنے آلاتِ پیداوار کا مالک ہوتا ہے۔ اس قسم کے پیداواری تعلقات فی الجملہ اس دور کی پیداواری طاقتوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس دور میں لوہے کے اوزار اور اچھی طرح بننے لگے تھے۔ زراعت، باغبانی (پھل پیدا کرنے کا فن کافی ترقی کرگیا تھا) اور دستکاری کے ساتھ ساتھ صنعت (مثلاً بڑے پیمانے پر کرگھوں سے کپڑا بنانا) بھی وجود میں آگئی تھی۔

اس نئی پیداواری طاقتوں کی ترقی اور ان کے مناسب استعمال کے لئے ضروری تھا کہ پیداوار کے سلسلے میں کام کرنے والے لوگ دل لگا کر کام کریں اور وہ کام میں ذاتی دلچسپی لیں۔ جاگیردار کے لئے لازمی ہوگیا کہ وہ غلاموں سے کام لینے کے طریقے کو ترک کردے۔ اس لئے کہ غلام بددلی سے کام کرتے تھے اور کام کو اچھی طرح کرنے یا بڑھانے میں انہیں کوئی ذاتی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ اب جاگیردار کے لئے زیادہ مفید تھا کہ وہ کاشتکار سے کام لے۔ اس لئے کہ فصل میں اس کا ذاتی حصہ بھی ہوتا تھا۔ جاگیردار اپنی رعایا سے پیداوار کا ایک حصہ لیتا تھا۔ اسی طرح سے

دستکار اپنے آلاتِ پیداوار کا مالک ہوتا تھا اور جن چیزوں کو وہ بناتا تھا اس میں اس کا بھی حصہ ہوتا تھا۔

ان حالات میں ذاتی ملکیت کے طریقے کو اور بھی فروغ ہوا۔ لیکن جاگیری نظامِ معیشت میں بھی مالک طبقہ محنت کرنے والی اقلیت کا استحصال کرتا تھا اور یہ استحصال غلامی کے مقابلے میں کچھ ہی کم تھا۔ اس لئے جاگیری نظام میں بھی ظالم اور مظلوم، استحصال کرنے والوں میں اور ان میں جن کا استحصال ہوتا تھا سخت طبقاتی جنگ کسی نہ کسی شکل میں جاری رہتی۔

۴۔ سرمایہ دارانہ نظام:

سرمایہ دارانہ نظام میں پیداواری تعلقات کی بنیاد یہ ہے کہ سرمایہ دار ذرائع پیداوار کا مالک ہوتا ہے۔ لیکن ان کی ملکیت ان لوگوں پر نہیں ہوتی جن سے وہ مزدوری دے کر کام لیتا ہے۔ سرمایہ دار مزدوروں کو غلاموں کی طرح نہ تو خرید اور بیچ سکتا ہے اور نہ انہیں قتل کرنے کا اسے حق ہے۔ وہ ان پر وہ حقوق نہیں رکھتا جو کہ جاگیردار کو زرعی غلاموں (کاشتکار) پر ہوتے ہیں۔ اس لئے مزدور ذاتی طور پر آزاد ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ مزدوروں کے پاس ذرائع پیداوار نہیں ہوتے جو کہ سرمایہ دار کی ملکیت ہوتے ہیں اس لئے مزدور اپنے کو بھوکا مرجانے سے بچانے کے لئے اس پر مجبور ہوتے ہیں کہ اپنی استعدادِ محنت (یا کام کی طاقت) کو سرمایہ دار کے ہاتھ فروخت کریں، اور اس طرح سرمایہ دارانہ استحصال کا شکار ہوجائیں۔ ذرائع پیداوار پر سرمایہ داروں کے قبضے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ جاگیری نظام ٹوٹنے لگتا ہے اور زمین کسانوں کی ملکیت ہوجاتی ہے اور دست کار اور مضارع جاگیری جبر سے آزاد ہوکر آزادانہ کام کرنے لگتے ہیں لیکن یہ سرمایہ داری کے ابتدائی دور میں ہوتا ہے۔

طرف محنت کرنے والوں کی اکثریت جن کا استحصال ہوتا تھا۔ ایک طرف وہ تھے جو تمام حقوق کے مالک تھے۔ دوسری طرف وہ تھے جن کا کوئی حق نہ تھا۔ ان دونوں طبقوں میں کشاکش اور کسی نہ کسی شکل میں باہمی لڑائی نے مستقل شکل اختیار کر لی۔

۳۔ جاگیری نظام:

جاگیری نظام میں پیداواری تعلقات کی بنیاد یہ ہے کہ جاگیردار، راجہ، نواب، ذرائع پیداوار کا تو مالک ہوتا ہے لیکن مزارع یا کاشتکار پر اس کی ملکیت پوری نہیں ہوتی۔ وہ ایک غلام کی طرح اسے مار نہیں سکتا۔ لیکن اسے خریدنے اور بیچنے کا حق ہوتا ہے اور جہاں جاگیردار کے جاگیرانہ حقوق ہوتے ہیں اسی کے ساتھ ساتھ کاشتکار یا دستکار (جو اس کی جاگیر پر رعایا کے طور پر رہتا ہے) اپنے آلات پیداوار کا مالک ہوتا ہے۔ اس قسم کے پیداواری تعلقات فی الجملہ اس دور کی پیداواری طاقتوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس دور میں لوہے کے اوزار اور اچھی طرح بننے لگے تھے۔ زراعت، باغبانی (پھل پیدا کرنے کا فن کافی ترقی کر گیا تھا) اور دستکاری کے ساتھ ساتھ صنعت (مثلاً بڑے پیمانے پر کرگھوں سے کپڑا بنانا) بھی وجود میں آ گئی تھی۔

اس نئی پیداواری طاقتوں کی ترقی اور ان کے مناسب استعمال کے لئے ضروری تھا کہ پیداوار کے سلسلے میں کام کرنے والے لوگ دل لگا کر کام کریں اور وہ کام میں ذاتی دلچسپی لیں۔ جاگیردار کے لئے لازمی ہو گیا کہ وہ غلاموں سے کام لینے کے طریقے کو ترک کر دے۔ اس لئے کہ غلام بددلی سے کام کرتے تھے اور کام کو اچھی طرح کرنے یا بڑھانے میں انہیں کوئی ذاتی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ اب جاگیردار کے لئے زیادہ مفید تھا کہ وہ کاشتکار سے کام لے۔ اس لئے کہ فصل میں اس کا ذاتی حصہ بھی ہوتا تھا۔ جاگیردار اپنی رعایا سے پیداوار کا ایک حصہ لیتا تھا۔ اسی طرح سے

دستکار اپنے آلات پیداوار کا مالک ہوتا تھا اور جن چیزوں کو وہ بناتا تھا اس میں اس کا بھی حصہ ہوتا تھا۔

ان حالات میں ذاتی ملکیت کے طریقے کو اور بھی فروغ ہوا۔ لیکن جاگیری نظام معیشت میں بھی مالک طبقہ محنت کرنے والی اقلیت کا استحصال کرتا تھا اور یہ استحصال غلامی کے مقابلے میں کچھ ہی کم تھا۔ اس لئے جاگیری نظام میں بھی ظالم اور مظلوم، استحصال کرنے والوں میں اور ان میں جن کا استحصال ہوتا تھا سخت طبقاتی جنگ کسی نہ کسی شکل میں جاری رہتی۔

۴۔ سرمایہ دارانہ نظام:

سرمایہ دارانہ نظام میں پیداواری تعلقات کی بنیاد یہ ہے کہ سرمایہ دار ذرائع پیداوار کا مالک ہوتا ہے۔ لیکن ان کی ملکیت ان لوگوں پر نہیں ہوتی جن سے وہ مزدوری دے کر کام لیتا ہے۔ سرمایہ دار مزدوروں کو غلاموں کی طرح نہ تو خرید اور بیچ سکتا ہے اور نہ انہیں قتل کرنے کا اسے حق ہے۔ وہ ان پر وہ حقوق نہیں رکھتا جو کہ جاگیردار کو زرعی غلاموں (کاشتکار) پر ہوتے ہیں۔ اس لئے مزدور ذاتی طور پر آزاد ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ مزدوروں کے پاس ذرائع پیداوار نہیں ہوتے جو کہ سرمایہ دار کی ملکیت ہوتے ہیں اس لئے مزدور اپنے کو بھوکا مر جانے سے بچانے کے لئے اس پر مجبور ہوتے ہیں کہ اپنی استعداد محنت (یا کام کی طاقت) کو سرمایہ دار کے ہاتھ فروخت کریں، اور اس طرح سرمایہ دارانہ استحصال کا شکار ہو جائیں۔ ذرائع پیداوار پر سرمایہ داروں کے قبضے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ جاگیری نظام ٹوٹنے لگتا ہے اور زمین کسانوں کی ملکیت ہو جاتی ہے اور دستکار اور مزارع جاگیری جبر سے آزاد ہو کر آزادانہ کام کرنے لگتے ہیں لیکن یہ سرمایہ داری کے ابتدائی دور میں ہوتا ہے۔

دستکاری کی صنعتوں اور دوسری صنعتوں کی جگہ اب بڑی بڑی فیکٹریاں اور کارخانے وجود میں آتے ہیں۔ ادھر زمین پر زراعت بھی ایک حد تک سرمایہ دارانہ طریقہ سے ہوتی ہے، جس طرح امریکہ میں بڑے بڑے فارم بنتے ہیں اور ان پر مشینوں کے ذریعے کھیتی ہوتی ہے۔

سرمایہ داری عہد کی پیداواری طاقتوں کو بروئے کار لانے کے لئے ضروری ہے کہ پیداوار کے لئے کام کرنے والے محنت کش، دیہات کے جاگیری کاشتکاروں کے مقابلے میں زیادہ چاق و چوبند اور سمجھ دار ہوں۔ ان میں اس کی صلاحیت ہو کہ وہ مشینوں پر ٹھیک سے کام کرسکیں۔ اس لئے سرمایہ دار دیہات کے جاگیری کاشتکاروں کے مقابلے میں مزدوری پیشہ محنت کشوں سے کام لینا بہتر سمجھتا ہے۔ جو دیہاتی مزارعوں کے مقابلے میں مشینوں کا کام بہتر کرسکتے ہیں۔

سرمایہ داری نے پیداواری طاقتوں کو بہت زیادہ فروغ دیا لیکن وہ اسی الجھنوں، ایسی متضاد کیفیتوں اور حالتوں کے چکر میں گرفتار ہوگئی ہے جس سے نجات پانا اس کے لئے ناممکن ہے۔ سرمایہ داری کے تضاد کیا ہیں؟

پہلے تو یہ کہ سرمایہ دار اس کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لئے زیادہ سے زیادہ چیزیں تیار کریں۔ ان چیزوں کو بازار میں زیادہ سے زیادہ بیچنے کے لئے اور دوسروں کی بنائی ہوئی چیزوں کے مقابلے میں بازی لے جانے کے لئے وہ ان کی قیمت کم از کم رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ داروں کا آپس میں مقابلہ ہوتا ہے اور وہ سرمایہ دار جو چھوٹے ہوتے ہیں ان کا دیوالہ نکل جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ تمام لوگ جو چھوٹے پیمانے پر چیزیں بناتے ہیں (مثلاً کپڑے کی وہ صنعت جس کا انحصار چرخے یا کرگھے پر ہے) بند ہو جاتے ہیں۔ اس طرح سماج میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہو جاتی ہے جن کی معاشی حالت تباہ ہوتی ہے

اور ان کی قوتِ خرید بالکل کم ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں بڑے سرمایہ داروں کے یہاں کی بنی ہوئی چیزوں کے خریدنے والوں کی تعداد بھی گھٹ جاتی ہے اور ان کے لئے اپنی چیزوں کا بیچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ سرمایہ دار منافع خوری کی غرض سے پیداوار کو فروغ دیتے ہیں تو وہ بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں قائم کرتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں لاکھوں مزدور بھی بڑے بڑے مرکزوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ سرمایہ داری پیداوار کے عمل میں ایک اجتماعی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور اس طرح خود اپنی بنیادوں کو کھوکھلا کرتی ہے۔ پیداوار میں اجتماعی کیفیت (مزدوروں کا ایک مرکز پر جمع ہونا، ایک ساتھ مل کر کام کرنا وغیرہ) کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ ذرائع پیداوار کی ملکیت بھی اجتماعی یا سماجی ہو۔ اس طرح ذرائع پیداوار پر سرمایہ دارانہ انفرادی ملکیت اور پیداوار میں اجتماعی کیفیت میں ایک تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔

پیداواری طاقتوں اور پیداواری تعلقات کے مابین یہ ایسے تضاد ہیں جن کا حل سرمایہ دارانہ نظام کے اندر ناممکن ہے۔ اس تضاد کا نتیجہ ایک خاص قسم کے معاشی بحران یا گڑبڑ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جسے سرمایہ دارانہ اصطلاح میں ''پیداوار کی زیادتی کا بحران'' کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب سرمایہ دار یہ دیکھتے ہیں کہ عام لوگوں کی مالی تباہی کے سبب (جو خود سرمایہ داروں کی حرکتوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے) ان کے مال کی مانگ نہیں ہوتی تو وہ بنی ہوئی چیزوں اور دوسری پیداوار کو برباد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ پیداوار کے عمل کو روک دیتے ہیں۔ اور پیداواری طاقتوں (فیکٹریوں، مشینری وغیرہ) کو برباد کرنے لگتے ہیں۔ سرمایہ دار یہ سب کچھ ایسے وقت میں کرتے ہیں جب کہ ہزاروں لاکھوں انسان بے روزگاری اور فاقہ کی مصیبت سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس ہولناک مصیبت کا سبب یہ نہیں کہ کھانے پینے

اور زندگی کے دوسرے ضروری سامان کی سماج میں کمی ہوتی ہے۔ یہ مصیبت اس لئے آتی ہے کہ سرمایہ دار پیداوار کی ''زیادتی'' کے بحران میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے پیداواری تعلقات سماج کی پیداواری طاقتوں کے مطابق یاان کے ہم آہنگ نہیں ہیں اوران میں ایسا باہمی تضاد ہوگیا ہے جسے سرمایہ داری نظام کے اندر دور نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر انقلاب پرورش پا رہا ہے۔ اس انقلاب کا مقصد یہ ہوگا کہ ذرائع پیداوار پر سرمایہ دارانہ ملکیت کو سوشلسٹ یا اشتراکی ملکیت سے بدل دے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ ان حالات میں سرمایہ دارانہ سماج میں امیر اور غریب، ظالم اور مظلوم، سرمایہ دار اور مزدور کے مابین سخت طبقاتی کشمکش اور جنگ جاری رہے گی۔

۵۔ اشتراکی یا سوشلسٹ نظام:

اشتراکی یا سوشلسٹ نظام میں پیداواری تعلقات کی بنیاد یہ ہے کہ اس میں ذرائع پیداوار اجتماعی یا سماجی ملکیت ہوتے ہیں۔ اس قسم کا نظام سوویت یونین میں قائم ہے۔ یہاں نہ کوئی استحصال کرنے والا گروہ ہے اور نہ ایسے لوگ ہیں جن کا استحصال ہوتا ہے۔ یہاں ظلم کرنے والے امیر طبقے اور ان کا شکار ہونے والے مزدوری کے غلام اب باقی نہیں ہیں۔ اس اشتراکی سماج میں جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں انہیں کام کرنے والوں میں ان کی محنت کے مطابق تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس سماج کا اصول یہ ہے کہ ''جو شخص کام نہیں کرتا اسے کھانے کو بھی نہیں ملے گا۔'' یہاں پیداوار کے لئے جو لوگ محنت کرتے ہیں ان میں رفیقانہ اشتراکِ عمل اور اجتماعی تعاون کے تعلقات ہیں۔ کوئی دوسرے کی محنت سے نفع اندوزی نہیں کرتا۔

اس اشتراکی نظام میں پیداواری تعلقات، پیداواری طاقتوں سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں، اوران سے ہم آہنگ ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پیداواری عمل کی اجتماعی ہیئت اور پیداواری طاقتوں کی اجتماعی یا سماجی ملکیت میں اتحاد ہے۔ پیداوار کے سلسلے میں اجتماعی طریقہ کار اور پیداواری طاقتوں کی انفرادی سرمایہ دارانہ ملکیت کا تضاد اب باقی نہیں رہتا ہے۔

اسی سبب سے سوویت یونین کے اشتراکی نظام معیشت میں پیداوار کی زیادتی کا بحران اور اس قسم کی مہمل وارداتیں بالکل نہیں ہوتیں۔

اسی سبب سے سوویت یونین کے اشتراکی نظام میں پیداواری طاقتوں کا برابر فروغ ہوتا رہتا ہے اور وہاں کے رہنے والوں کی مادی خوشحالی بڑھتی رہتی ہے۔ اشتراکی پیداواری تعلقات پیداواری طاقتوں کو بڑھنے کا پورا پورا موقع دیتے ہیں۔

اوپر ہم نے انسانی تاریخ کے شروع زمانے سے لے کر موجودہ عہد تک کے مختلف پیداواری تعلقات کا ایک خاکہ پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کا ثبوت بہم پہنچایا کہ پیداواری تعلقات کا ارتقاء دراصل پیداواری طاقتوں کے ارتقاء پر منحصر ہے اور پیداواری طاقتوں کے ارتقاء میں سب سے زیادہ اہمیت آلات واوزار پیداوار کے ارتقاء اوران میں تبدیلیوں اور ایجادوں کو حاصل ہے۔ آلات واوزار پیداوار کی نئی ایجادوں اور ترقی سے پیداواری طاقتیں بدلتی ہیں اوران میں ترقی ہوتی ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو یہ لازمی کہ جلد یا بدیر سماج کے پیداواری تعلقات، یعنی وہ معاشی رشتے جو انسانوں کے مابین پیداواری عمل کے سلسلے میں پیدا ہوتے ہیں وہ بھی بدل کر نئی پیداواری طاقتوں سے ہم آہنگ ہوجائیں اوران سے مطابقت کرنے لگیں۔

مارکس کے رفیق اینگلز نے کمیونسٹ مینی فسٹو کے دیباچے میں تاریخی مادیت کے متعلق یوں لکھا ہے:

''کسی تاریخی عہد کی معاشی پیداوار اور سماجی ہیئت جو کہ لازمی طور پر اسی سے بنتی ہے۔ اس عہد کی سیاسی اور ذہنی تاریخ کی بنیاد ہوتے ہیں ...''

اس لئے (زمین پر مشترک ملکیت کے قدیم عہد کے خاتمے کے بعد سے) تمام تاریخ طبقاتی جنگ کی تاریخ رہی ہے۔ استحصال کرنے والوں اور ان لوگوں میں جن کا استحصال ہوتا ہے حاکموں اور محکوموں میں، سماجی ارتقاء کے مختلف دوروں میں جنگ جاری رہی ہے لیکن اب یہ جنگ ایک ایسے درجے پر پہنچ گئی ہے جبکہ مظلوم اور محکوم طبقہ (مزدور یا پرولتاریت) اپنے کو اس طبقے سے آزاد نہیں کرا سکتا جو کہ اس پر ظلم و تعدی کرتا ہے (یعنی سرمایہ دار یا بورژواسے) جب تک کہ وہ ساتھ ہی ساتھ سارے سماج کو ہمیشہ کے لئے استحصال، ظلم اور طبقاتی جنگ سے آزاد نہ کردے۔''

پیداوار کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ نئی پیداواری طاقتیں اور ان کے مطابق پیداواری تعلقات، پرانے نظام سے باہر یا علیحدہ یا پرانے نظام کے مٹ جانے کے بعد وجود میں نہیں آتے وہ پرانے نظام کے اندر اندر اور اس کے رہتے ہوئے پیدا ہوتے اور بڑھتے ہیں۔

مزید برآں نئی پیداواری طاقتوں اور پیداواری تعلقات کا پرانے نظام کے اندر شروع ہونا اور بڑھنا انسانوں کے جانے بوجھے ہوئے عمل کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ ان کا پیدا ہونا انسانوں کی مرضی سے بے تعلق ہوتا ہے۔ وہ آزادانہ اپنے طور پر وجود میں آتے ہیں۔

اس کا پہلا سبب تو یہ ہے کہ انسان اس پر مجبور ہیں کہ اپنی زندگی کے لئے ضروری چیزیں پیدا کرنے کے لئے وہ اپنی پیداواری طاقتوں کو استعمال کریں اور انہیں پیداواری تعلقات کے اندر زندگی بسر کریں جو کہ ان کو گزشتہ نسلوں سے ورثے میں ملی

ہیں اور جن کے ماحول میں وہ پیدا ہوئے ہیں۔ ہر نئی نسل اپنے سے پہلے والی نسل کی پیداواری طاقتوں اور پیداواری تعلقات کی وارث ہوتی ہے اور اپنی بقاء کے لئے وہ ان طاقتوں کا استعمال کرتی ہے جو کہ اسے سماج میں موجود ملتی ہیں۔

اس کا دوسرا سبب یہ ہے کہ جب انسان پیداوار کے آلات اور اوزار میں کوئی تبدیلی یا ترقی کرتے ہیں۔ جب اس سلسلے میں نئی ایجادیں کرتے ہیں اور اپنی پیداواری طاقت میں اضافہ کرتے ہیں تو وہ یہ نہیں سوچتے کہ ان تبدیلیوں، ایجادوں اور ترقیوں کا سماجی یا معاشرتی نتیجہ کیا ہوگا۔ پیداواری طاقتوں میں تبدیلیاں کرتے وقت ان کا مقصد صرف اپنے کام کے بوجھ کو گھٹانا یا اسی قسم کا کوئی دوسرا فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔

مثلاً جب قدیم اشتراکی نظام میں لوگوں نے پتھر کے آلات و اوزار کا استعمال ترک کر کے دھاتوں اور خاص طور پر لوہے کے اوزار کی ایجاد کی اور انہیں استعمال کرنا شروع کیا تو انہیں اس امر کا شعور یا علم نہیں تھا کہ آلات پیداوار میں یہ تبدیلی آگے چل کر قدیم اشتراکی نظام ہی کو توڑ دے گی اور اس نظام کی جگہ غلامی کا نظام وجود میں آئے گا۔ جن لوگوں نے نئے اوزار اور ہتھیار بنائے اور ان کا استعمال شروع کیا۔ ان کا مقصد تو ایک فوری مادی فائدہ حاصل کرنا تھا۔ وہ تو اپنی روزمرہ کی زندگی میں کچھ فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کو اپنے عمل کے دوررس سماجی نتیجوں کا، اس بات کا کہ پیداوار میں تبدیلی کی وجہ سے سماج کا ڈھانچہ بھی بدل جائے گا۔ نہ علم تھا اور نہ شعور۔

یا مثلاً جب یورپ میں سرمایہ داروں نے چھوٹے دست کاروں کے کارخانوں کی جگہ بڑے بڑے کارخانے قائم کئے تو انہیں اس کا علم یا شعور نہیں تھا کہ اس تبدیلی کے سماجی نتائج ایسے انقلابوں کی شکل میں رونما ہوں گے، جو بادشاہوں کی طاقت کو توڑ

دیں گے اور جاگیری نظام ختم کر دیں گے۔ سرمایہ دار طبقہ خود تو محض یہی چاہتا تھا کہ وہ بھی محض اسی شان وشوکت کا مالک ہو جائے جو جاگیری امراء کو حاصل تھیں۔ وہ بڑے کارخانے قائم کر کے زیادہ اور سستا مال پیدا کرنا چاہتا تھا جسے وہ ایشیا کی منڈیوں اور نئے دریافت شدہ امریکہ میں فروخت کر کے زیادہ سے زیادہ نفع کما سکے۔ اس کا شعوری عمل تو اسی حد تک محدود تھا لیکن معاشی طاقت میں سرمایہ داروں کی وجہ سے جو تبدیلی پیدا ہوئی اس کے دُوررَس نتیجے پیدا ہوئے اس کی وجہ سے سماج میں نئی طاقتیں ابھریں اور انہوں نے سماج کا ڈھانچہ بدل دیا۔

یا جب مثلاً زارشاہی کے عہد میں روسی سرمایہ داروں نے غیر ملکی سرمایہ داروں کے ساتھ مل کر روس میں بڑے پیانے کی مشینی صنعتیں قائم کیں اور بڑی بڑی ملیں اور فیکٹریاں روس میں جگہ جگہ چلنے لگیں تو انہیں اس کا علم نہیں تھا کہ پیداواری طاقتوں میں اس اضافے کی وجہ سے کون سے معاشرتی نتائج برآمد ہوں گے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کا سماجی نتیجہ یہ ہوگا کہ کارخانوں میں کام کرنے والا مزدور طبقہ (پرولتاریت) معاشرتی طاقتوں کی اس نئی تشکیل میں روسی کسانوں کے ساتھ اتحاد کر کے روس میں سوشلسٹ انقلاب پیدا کرنے میں کامیاب ہوگا۔ سرمایہ دار تو صرف یہ چاہتے تھے کہ صنعتی پیداوار کو خوب بڑھا کر روس کی منڈی میں زیادہ سے زیادہ مال بیچ کر اجارہ دار بن جائیں اور زیادہ سے زیادہ نفع کمائیں۔ ان کے شعوری عمل کا دائرہ محض منافع خوری تک محدود تھا۔

یا مثلاً جب انگریز سرمایہ داروں نے ہندوستان میں ریل کا جال بچھایا اور جگہ جگہ ریل کی صنعت قائم کی تو انہیں اس کا شعور نہیں تھا کہ وہ ہندوستان میں براہ راست ایک جدید سرمایہ دارانہ مشینی صنعت کو قائم کر کے یہاں کی پیداواری طاقت میں ایک ایسا اضافہ کر رہے ہیں جو آگے چل کر بڑی سماجی تبدیلیوں کا باعث ہو سکتا

ہے۔ انگریز سرمایہ داروں کا مقصد ہندوستان میں ریلیں بنانے سے محض اتنا تھا کہ وہ اپنی فوجوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے لے جا سکیں۔ انگلستان میں بنے ہوئے مال کو ہندوستان کے کونے کونے میں آسانی سے بیچ سکیں اور براہ راست ریلوں کے ذریعے سے خوب نفع کمائیں۔ لیکن وسائل آمدورفت اور رسل و رسائل، ریل، تار وغیرہ کے قائم ہو جانے کے بعد پھر ہندوستان میں انگریزی اور ہندوستانی سرمایہ داروں نے اور بھی ترقی کی۔ کپڑا اور سوت بنانے کی بڑی بڑی ملیں، جُوٹ کی صنعت اور لوہے فولاد اور انجینئرنگ کی صنعت اور کان کنی کی صنعت کا زبردست فروغ ہوا۔ وہ انگریز اور ہندوستانی سرمایہ دار جو ہمارے ملک میں ریلوں اور بڑے پیانے کی صنعتوں کو قائم کر رہے تھے یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے عمل کا نتیجہ سماجی طاقتوں کی ایک نئی گروہ بندی اور ان کی ایک نئی تشکیل کی صورت میں ظاہر ہوگا یا صنعتی مزدور طبقہ وجود میں آئے گا جس کا تاریخی کام یہ ہوگا کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کی مکمل آزادی کی جدوجہد، ہندوستان اور پاکستان میں جمہوری انقلاب اور ہندوستان اور پاکستان میں سوشلسٹ اشتراکی نظام کے قائم کرنے کے کام میں تمام دوسرے محنت کش اور مظلوم (کسان، درمیانی طبقے) طبقوں کی رہنمائی کرے اور سیاسی اور سماجی انقلاب کی مہم کو کامیابی کی منزل تک پہنچائے۔ سرمایہ دار تو ہندوستان کی منڈی میں اپنا مال بیچ کر زیادہ سے زیادہ نفع کمانا چاہتے تھے۔ اس سے زیادہ ان کا مقصد نہ تھا۔ لیکن ان کے غیر شعوری عمل سے سماج میں ایک ایسی نئی طاقت (مزدوروں کی انقلابی اشتراکی تحریک) نے جنم لیا جو بالآخر زمینداروں اور ان کے دوست اور سرپرست انگریز سامراجیوں کے قائم کئے ہوئے جابرانہ معاشی اور سیاسی نظام کا قلع قمع کر کے آزادی، جمہوریت اور اشتراکیت کے نظام کو قائم کرے گی۔

لیکن یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ پرانے سماجی نظام پرانے پیداواری تعلقات کی جگہ نیا سماجی نظام نئے پیداواری تعلقات، آسانی سے یا بغیر کسی جدوجہد اور تصادم کے قائم ہو جاتے ہیں۔ نئے سماجی نظام کو، نئے پیداواری رشتوں کو انقلابی عمل کے ذریعے سے ہی قائم کیا جاسکتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک حد اور مدت تک تو پیداواری طاقتوں اور پیداواری تعلقات میں تبدیلیاں پرانے نظام کے ڈھانچے کے اندر خود بخود ہوتی رہتی ہیں۔ انسانوں کے شعوری عمل اور ماضی کا ان تبدیلیوں کے ہونے میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ لیکن ایسا ایک حد تک ہی ہوتا ہے۔ جب نئی پیداواری طاقتیں اس طرح بڑھتے بڑھتے کافی پختہ اور مضبوط ہو جاتی ہیں تو پھر وہ پرانے سماجی تعلقات (مثلاً جدید بڑے پیمانے کی مشینی صنعت جس میں کام اجتماعی طور سے ہوتا ہے اور سرمایہ داروں کی انفرادی کیفیت ہے) اور ان تعلقات کو برقرار رکھنے والے حکمران اور مالک گروہ پیداواری طاقتوں کی ترقی کی راہ میں ناقابل برداشت رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ اس رکاوٹ کو ہٹانے یعنی اس حکمران طبقے کی طاقت کو توڑنے اور سماجی ارتقاء کے راستے کو صاف کرنے کی ذمہ داری نئے طبقوں پر عائد ہوتی ہے۔ سماج کو آگے بڑھانے والا نیا طبقہ مظلوم اور محکوم طبقوں کو متحد کر کے اپنے شعوری اور انقلابی عمل سے زور اور طاقت کا استعمال کرتا ہے اور پرانے رجعت پرست حکمرانوں کا تختہ اُلٹ کر سیاسی طاقت اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔

چونکہ انقلاب ایک شعوری عمل کا نتیجہ ہوتا ہے یعنی چونکہ انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے لوگوں کو سوچ سمجھ کر کام کرنا اور جدوجہد کرنا ہوتا ہے۔ سماجی طاقتوں اور سماجی تعلقات مختلف طبقوں کی پوزیشن، ان کی حالت، ان کی طاقت، حکمرانوں کی طاقت اور محکوم طبقوں کی طاقت۔ ان کی ذہنی کیفیت اور ان کی تنظیم وغیرہ کو بدلتے ہوئے حالات میں ہردم جانچنا اور پرکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے اس انقلابی جدوجہد میں

نئے ترقی پسند انقلابی خیالات اور نظریوں، نئی سیاسی تنظیموں اور اداروں اور نئی سیاسی طاقت کی جو پرانے نظام کو ختم کرنے اور نئے نظام، نئے معاشی اور سماجی تعلقات کو قائم کرنے کا فرض پورا کرے، بے حد زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

نئے ترقی پسند انقلابی نظریے اور خیالات نئی پیداواری طاقتوں اور پرانے پیداواری تعلقات کے تصادم سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ نئے سماجی تصورات ان حالات میں وجود میں آنے کے بعد بہت بڑی ذہنی اور روحانی قوت کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ محنت کش عوام میں، ان لوگوں میں جن کے معاشی حالاتِ زندگی اس کے متقاضی ہوتے ہیں کہ سماج کو نئے سانچے میں ڈھالا جائے، پھیلتے ہیں۔ ان کے دماغ میں سماجی حقیقتوں کی روشنی پیدا کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں انقلابی جوش اور ولولہ پیدا کر کے انہیں ایک عظیم الشان سیاسی فوج میں بدل دیتے ہیں۔ وہ انہیں اس کے لئے تیار کرتے ہیں کہ سماج کی معاشی طاقتوں کو آزاد کرنے کے لئے وہ پرانے معاشی رشتوں کی زنجیر کو اپنے انقلابی عمل سے توڑ دیں۔ اس طرح لاشعوری ارتقاء کی جگہ بیدار اور باشعور انسانوں کا عمل لے لیتا ہے۔ پُرامن تبدیلی کا دَور ختم اور پُرتشدد اور پُرزور جدوجہد کا دَور شروع ہوتا ہے۔ ارتقاء کی جگہ انقلاب لے لیتا ہے۔ مارکس نے کہا ہے:

> ''مزدور طبقہ (پرولتاریہ) کو سرمایہ دار طبقے سے جدوجہد کے دوران میں حالات مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی طبقہ داری تنظیم کرلے۔ انقلاب کے ذریعے سے وہ (مزدور طبقہ) اپنے کو حکمران طبقہ بنا لیتا ہے اور اس طرح وہ بزور پرانے حالاتِ پیداوار کو مٹا دیتا ہے۔''

(کمیونسٹ مینی فسٹو)

اسی مینی فسٹو میں مارکس نے یہ بھی کہا ہے:

''مزدور طبقہ اپنے سیاسی اقتدار کو سرمایہ داروں سے تمام سرمایہ بتدریج چھین لینے اور تمام ذرائع پیداوار کو ریاست کے ہاتھوں میں لے لینے کے لئے استعمال کرے گا۔ یہ ریاست عبارت ہوگی مزدور طبقے (پرولتاریت) سے جس نے اپنے آپ کو حکمران طبقے کی حیثیت سے منظم کیا ہوگا۔''

اور یہ سب کچھ قوت کے بل پر ہوگا جیسا کہ مارکس نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''سرمایہ'' میں لکھا ہے۔ ''ہر پرانی سوسائٹی کے بطن سے نئی سوسائٹی کو باہر لانے کا کام قوت ہی کے ذریعے انجام پاتا ہے۔''

اب ہم تاریخی مادیت کی اس ساری بحث کو کارل مارکس ہی کے لفظوں میں ختم کریں گے۔ کارل مارکس نے اپنی کتاب ''معاشیات کی تحقیقی تنقید'' کے دیباچے میں تاریخی مادیت کا لب لباب ان لفظوں میں کیا ہے:

''سماجی پیداوار کے دوران میں لوگوں کو آپس میں ایسے تعلقات قائم کرنے ہوتے ہیں جن کے بغیر سماجی پیداوار ممکن نہیں ہو سکتی۔ ان تعلقات کے قائم کرنے میں ان کی مرضی کو دخل نہیں ہوتا۔ پیدائشِ دولت کے یہ تعلقات، پیدائشِ دولت کے مادی عناصر کی نشوونما کے ایک خاص دور سے مطابقت رکھتے ہیں۔ سماج کا معاشی ڈھانچہ پیداوار کے انہیں تعلقات کے مجموعے پر مشتمل ہوتا ہے۔ سماج کا یہ معاشی ڈھانچہ ہی دراصل وہ حقیقی بنیاد ہے جس پر سماج کی قانونی اور سیاسی عمارت کھڑی ہوتی ہے

اور جس سے سماجی شعور کی مختلف شکلیں میل کھاتی ہیں۔ مادی زندگی میں پیداوار کا جو طریقہ ہوتا ہے۔ اسی سے عام طور پر سماجی، سیاسی اور ذہنی زندگی کا عمل معین ہوتا ہے۔ انسانوں کے وجود کو معین کرنے والا ان کا شعور نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس ان کا سماجی وجود ان کے شعور کو معین کرتا ہے۔ سماج میں پیداوار کے مادی عناصر اپنے نشوونما کی ایک مخصوص منزل پر پہنچ کر پیداوار کے مروجہ تعلقات سے ٹکرانے لگتے ہیں۔ اس بات کو قانونی زبان میں یوں کہیں گے کہ پیداوار کے عناصر ان املا کی تعلقات سے متصادم ہوتے ہیں۔ جن کے تحت وہ اب تک کام کرتے رہے ہیں جو املا کی تعلقات اب تک عناصر پیداوار کی نشوونما کی ایک شکل تھے اور اب اس نشوونما کو روکنے لگتے ہیں۔ تب سماجی انقلاب کا دَور شروع ہوتا ہے۔ سماج کی معاشی بنیاد کے بدلنے سے سارا ڈھانچہ کافی تیزی سے بدل جاتا ہے۔ ان تبدیلیوں پر غور کرتے وقت پیداوار کے معاشی حالات میں جو مادی تبدیلی ہوتی ہے اور جس کا تعین سائنس کی طرح پوری صحت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے اس میں اور ان قانونی، سیاسی، مذہبی، جمالیاتی یا فلسفیانہ مختصراً یہ کہ ان ذہنی اشکال میں ہمیشہ تمیز کرنی چاہئے جن میں لوگوں کو اس تصادم کا علم ہوتا ہے اور وہ اسے دُور کرتے ہیں جس طرح کسی شخص کے بارے میں ہماری رائے کی بنیاد یہ نہیں ہوتی کہ وہ خود اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے اسی طرح ہم عہدِ تغیر کو خود اس عہد کے شعور سے نہیں جانچ سکتے۔ اس کے

برعکس اس عہد کے شعور کی تشریح مادی زندگی کے تضادوں اور
پیداوار کے سماجی عناصر اور پیداوار کے تعلقات کی باہمی
آویزش کے ذریعے کرنی چاہئے۔ کوئی سماجی نظام اس وقت تک
فنا نہیں ہوتا جب تک کہ پیداوار کی وہ تمام طاقتیں جن کی اس
سماجی نظام میں گنجائش ہے، پوری طرح نشوونما نہ پالیں اور
پیداوار کے نئے اور زیادہ ترقی یافتہ تعلقات اس وقت تک نہیں
اُبھرتے جب تک کہ ان کے وجود میں آنے کے لئے جن مادی
حالات کی ضرورت ہوتی ہے وہ حالات خود پرانی سوسائٹی کے
بطن کے اندر پختہ نہ ہوجائیں۔ یہی وجہ ہے کہ بنی نوع انسان
ہمیشہ صرف اتنے ہی فرائض اپنے ذمے لیتی ہے جتنے وہ انجام
دے سکتی ہے۔ اگر ہم اس مسئلہ پر زیادہ غور کریں تو ہم دیکھیں
گے کہ خود یہ فرض اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ اس کو پورا
کرنے کے لئے جن مادی حالات کی ضرورت ہوتی ہے وہ وجود
میں آچکے ہوتے ہیں یا وجود میں آنے والے ہوتے ہیں۔"

..............☆☆☆☆☆..............

ISBN 978-969-562-502-6